وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن —— لاہور

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱ / ۲۳۹۳۱

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳۴

شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۸۵ء

بمطابق

صفر المظفر ۱۴۰۶ھ

زرِ سالانہ ۳۰ روپے

فی شمارہ ۳/ روپے

چودھری رشید احمد

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

مکتبہ تنظیمِ اسلامی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی، فون ۲۱۶۵۸۶

مشمولات

※ تنظیمِ اسلامی پاکستان کا علاقائی اجتماع ۸۴ء ____ ۳

※ عرضِ احوال ____ ۵
جمیل الرحمٰن

※ حالاتِ حاضرہ پر ایک مبسوط تبصرہ ____ ۹
راولپنڈی میں امیرِ تنظیمِ اسلامی کی پریس کانفرنس

※ 'صبرِ محض' سے 'اقدام' تک (۲) ____ ۱۵
بسلسلہ اسلامی انقلاب: مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۸۴ء)
ڈاکٹر اسرار احمد

※ دِلِ افگندیم بِسمِ اللہِ مجریہا و مرسٰہا (۲) ____ ۳۷
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

※ رفتارِ کار ____ ۵۹
پشاور میں تنظیمِ اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع
مرتب: راجہ سردار احمد

※ گاہے گاہے باز خواں .... (۲) ____ ۶۵
ڈاکٹر اسرار احمد کے ۶۹ء ـ ۷۰ء کے بعض سیاسی تجزیے

دورانِ سال ۸۶-۱۹۸۵ء

تنظیمِ اسلامی پاکستان کا علاقائی اجتماع

اِن شاء اللہ العزیز

۸ تا ۱۰ نومبر ۱۹۸۵ء : حیدر آباد (سندھ)

میں منعقد ہوگا ——— جس میں ——— امیر تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد کے تین عمومی خطاب ہونگے:

(۱)

جمعہ ۸ نومبر کو قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد قبا، حیدر آباد میں

عنوان:

"حکمت و احکامِ جُمعہ"

(۲)

جُمعہ ۸ نومبر کو بعد نماز عشاء، ہوم اسٹیڈ ہال نزد گاڑی کھاتہ میں

عنوان:

"پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا اور کیوں؟"

(ورق الٹیے)

(۳)

ہفتہ ۹ نومبر کو بعد نماز عشاء، جامع مسجد دار العلوم لطیف آباد میں

عنوان: "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیسے؟"

مزید برآں

۹، ۱۰ نومبر ۸۵ء بروز ہفتہ و اتوار

حیدرآباد کاٹن اینڈ آئل ملز اولڈ پاور ہاؤس روڈ میں

صبح ساڑھے آٹھ تا ایک بجے دوپہر

تربیتی پروگرام

جاری رہے گا جس میں

نائب امیر تنظیم اسلامی میاں محمد نعیم، قیم تنظیم چوہدری غلام محمد، اسد الرحمٰن فاروقی (کراچی) اور ضمیر اختر صاحب (کراچی) مختلف تنظیمی و تربیتی موضوعات پر درس دینگے۔

المعلن: عبد القادر امیر تنظیم اسلامی حیدرآباد

(فون: ۳۴۲۰۴ - ۳۴۲۳۵ - ۲۴۸۳۵)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ احوال

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

الحمدللہ والمنہ 'میثاق' کا شمارہ بابت نومبر ۸۵ مطابق صفر المظفر ۱۴۰۶ھ ہدیۂ ناظرین ہے۔ ربِ کریم کا فضل ہے کہ ماہنامہ 'میثاق' معنوی اور صوری اعتبارات سے مسلسل ترقی پذیر ہے اور محترم مولانا سعید الرحمٰن صاحب کی ادارۂ تحریر میں شمولیت نے اس معاملے میں گویا مہمیز کا کام دیا ہے۔ گزشتہ دو شماروں میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ امیر تنظیم اسلامی کے قلم سے لکھی ہوئی دو اہم تحریریں "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان کے تحت شائع ہوئی ہیں۔ توقع ہے کہ اب جبکہ موصوف کے قلم کی گرہ کھل گئی ہے تو ان شاء اللہ آئندہ بھی ان کی تازہ ترین تحریریں شامل ہوتی رہیں گی اور قارئین کرام ان سے مستفید ہوں گے۔

گزشتہ شمارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ 'میثاق' جنوری تا مئی ۶۹ کے اداریوں کے چند اقتباسات ہدیۂ قارئین کئے گئے تھے اور اس ارادہ کا اظہار بھی کیا گیا تھا کہ بعض اہم چیزیں جو جولائی ۶۹ء، دسمبر ۷۱ء اور جنوری/فروری ۷۲ء میں موصوف کے قلم سے نکل کر "میثاق" میں شائع ہوئی تھیں اس خط کے ساتھ جو دسمبر ۸۲ء میں جنابِ صدر مملکت کو ارسال کیا گیا تھا، آئندہ شمارے میں شامل کی جائیں گی۔ چنانچہ یہ تمام چیزیں زیرِ نظر شمارہ میں قارئین کرام کے مطالعہ سے گزریں گی۔ توقع ہے کہ وہ ان تحریرات کو دلچسپ اور مفید بھی پائیں گے اور اس طرح ماضی کے آئینے میں ؎ "آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ" کے مصداق ان کیفیات کو محسوس بھی کریں گے۔

امیرِ محترم کی پاکستان میں دعوتی مصروفیات کا وہی عالم ہے جو قریباً چودہ پندرہ سال سے چل رہا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مہینہ ہوتا ہو جس میں موصوف کا ہفتہ میں دو روز سے زیادہ لاہور میں قیام رہتا ہو۔ اب نومبر و دسمبر میں بیرونِ پاکستان کے دو دورے طے ہو چکے ہیں۔ پہلا دورہ قریباً پندرہ دن کا بھارت بالخصوص حیدر آباد دکن کا ہوگا اور دوسرا دورہ ۱۰ تا ۲۰ دسمبر ۸۵ء ابوظہبی اور شاید متحدہ عرب امارات میں سے ایک دو مزید ممالک کا ہوگا۔ دوسری جانب قارئینِ میثاق کے علم میں ہے کہ ماہِ رمضان المبارک کے بعد سے امیرِ محترم کی صحت مسلسل خراب چل رہی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ موصوف کی مصروفیات کے باعث لاہور یا پاکستان کے کسی اور شہر میں آرام ملنا خاصا دشوار نظر آرہا تھا چنانچہ چند احباب کے مشورہ پر امیرِ محترم نے عمرہ اور چند روز بغرض آرام طائف میں قیام کا ارادہ کیا۔ اگرچہ

آج کل سعودی عرب کے لئے VISIT VISA کا حصول ایک نہایت مشکل امر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور ایسی شکل پیدا فرما دی کہ ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر امیر محترم کو VISIT VISA مل گیا۔ چنانچہ موصوف ۱۱ اکتوبر کو بعد نماز فجر اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ بغرض عمرہ عازم سفر ہوئے۔ عمرہ سے فارغ ہو کر وہ طائف تشریف لے جائیں گے جہاں ایک عشرہ سے زیادہ ایک رفیق کے مکان پر قیام رہے گا۔ ان شاء اللہ وہاں سے حرم نبوی علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام کی زیارت سے شاد کام و مشرف ہوتے ہوئے ان کی ۳۱ اکتوبر کو لاہور مراجعت ہوگی۔ اور موصوف یکم نومبر بروز جمعہ حسب دستور مسجد دارالسلام لاہور کے پروگرام نیز بعد مغرب واپڈا آڈیٹوریم میں "شام الہدیٰ" کے پروگرام کو سرانجام دیں گے ۔ قارئین کرام سے عرض ہے کہ وہ ان کی صحت کے لئے دعا کو اپنے معمولات میں شامل فرمائیں۔ اور حرمین شریف سے ان کی مراجعت صحت کاملہ اور ایک نئے ولولہ و جوشِ ایمانی کے ساتھ ہو۔

امسال تنظیم اسلامی کی مجلسِ مشاورت نے پہلی بار پانچ علاقائی اجتماعات کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و نصرت سے تین علاقائی اجتماعات ۔ (i) راولپنڈی / اسلام آباد (ii) کوئٹہ اور (iii) پشاور میں منعقد ہو چکے ہیں۔ الحمد للہ تینوں اجتماعات انتظامات اور توسیع دعوت کے نقطۂ نظر سے بہت کامیاب رہے۔ اب چوتھا علاقائی اجتماع ۸ تا ۱۰ نومبر ۸۵ء حیدر آباد (سندھ) میں منعقد ہو رہا ہے جس کا مفصل پروگرام اسی شمارہ میں شامل ہے۔ توقع ہے کہ صوبہ سندھ کے تمام رفقاءِ تنظیم اس اجتماع میں شرکت کی بھرپور کوشش کریں گے اور کوئی رفیق بھی واقعی عذرِ شرعی کے بغیر اس اجتماع سے غیر حاضر نہیں رہے گا ۔ رفقاء کے علاوہ جو حضرات تنظیم اسلامی کی دعوت اور اس کے کام کو قریب سے دیکھنا چاہیں ان کو بھی اس اجتماع میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ایسے حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنے ارادہ اور حیدر آباد تشریف آوری کے پروگرام سے جلد از جلد امیر تنظیم اسلامی حیدر آباد کو بذریعہ خط یا فون مطلع فرما دیں ۔ ان شاء اللہ العزیز پانچواں اور آخری علاقائی اجتماع ملتان میں فروری ۸۶ء میں منعقد ہوگا۔ جس کی تاریخوں اور مقام کا اعلان "میثاق" جنوری ۸۶ء کے شمارے میں کر دیا جائے گا۔

شام الھدیٰ کراچی کے ماہانہ انعقاد کا آغاز اکتوبر ۸۴ء سے ہوا تھا۔ الحمد للہ ستمبر ۸۵ء کو اس سلسلہ کا ایک سال مکمل ہو گیا ہے۔ اس دوران شام الہدیٰ کی ماہانہ حساب سے تو دس نشستیں منعقد ہوئیں چونکہ دسمبر ۸۴ء، اور جون ۸۵ء میں ایک مجبوری اور رمضان المبارک کی وجہ سے دو نشستوں کا انعقاد نہ ہو سکا۔ لیکن تعداد کے لحاظ سے پوری بارہ نشستیں منعقد ہو چکی ہیں۔ چونکہ جنوری ۸۵ء میں مسلسل تین نشستوں کا انعقاد ہوا تھا۔ تاج محل ہوٹل کی انتظامیہ کا شکریہ ہم پر واجب ہے کہ انہوں

نے اس مقصد کے لئے موتی محل آڈیٹوریم کو بلامعاوضہ استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے جبکہ اس آڈیٹوریم کا ایک تقریب کے استعمال کے لئے پندرہ ہزار روپے معاوضہ مقرر ہے۔

فاران کلب کراچی تبلیغ دین کا ایک معروف ادارہ ہے۔ ستمبر کی شام الہدیٰ منعقدہ ۲۱ ستمبر ۸۵ء کے متصلاً بعد یکم اکتوبر ۸۵ء کو اس کلب کی طرف سے موتی محل آڈیٹوریم تاج محل ہوٹل میں ایک محفل کا جناب جسٹس عبادت یار خاں صاحب جسٹس سندھ ہائی کورٹ کی صدارت میں بعد نماز مغرب انعقاد ہوا جس کے مہمان مقرر محترم ڈاکٹر صاحب تھے اور خطاب کا موضوع تھا "عقیدۂ توحید کے عملی تقاضے"۔ اس محفل میں بھی شرکاء کی تشریف آوری کا عالم قریباً وہی تھا جو "شام الہدیٰ" کا ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام نشستوں کے پُر ہونے کے بعد کثیر تعداد میں شرکاء کو اسٹیج پر اور اسٹیج اور نشستوں کے درمیان خالی جگہ پر فرش پر بیٹھنا پڑا۔ الحمد للہ فاران کلب کا یہ اجتماع بہت کامیاب رہا۔ امیر محترم کی قریباً ڈھائی گھنٹہ کی تقریر کو حاضرین نے پورے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ سماعت فرمایا اور اس سے اثر قبول کیا۔ ہم منتظمین فاران کلب کی خدمت میں اس مبارک اور عظیم اجتماع کے انعقاد پر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔

اس دورے میں امیر محترم نے ۲ اکتوبر ۸۵ء کو بعد نماز عشاء شمالی ناظم آباد بلاک جے کی جامع مسجد، مسجد بطحا میں "اسلامی انقلاب کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟" کے موضوع پر نہایت مفصل مدلل اور مؤثر خطاب ارشاد فرمایا۔ ان سطور کے عاجز راقم کا ارادہ ہے کہ جلد ہی اس خطاب کو کیسٹ سے منتقل کر لے تاکہ اس کی میثاق میں یا کتابی شکل میں اشاعت کا اہتمام ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ سے اس کام میں توفیق اور نصرت کی دعا ہے: وما ذالک علی اللہ بعزیز!

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور سے ان کے انتقال سے قریباً ایک ماہ قبل ۲۲ اپریل ۱۹۸۵ء کو ان کے اور امیر محترم کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی ریکارڈنگ کے وقت بھی یہ عاجز موجود تھا اور اسی نے اُسے کیسٹ سے من وعن منتقل کر کے 'میثاق' کے اگست ۸۵ء کے شمارے میں "چند باتیں ــ چند یادیں" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ مولانا مرحوم نے اس گفتگو میں تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں جناب مولانا منظور نعمانی دامت برکاتہم اور جناب مولانا ابو الحسن علی میاں زید مجدہم کی کتاب "کاروانِ زندگی" کے حوالے سے کچھ باتیں ارشاد فرمائی تھیں۔ مولانا نعمانی مدظلہ نے اپنے مکتوب میں مولانا اکبر آبادی مرحوم کی ذات کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں تردید فرمادی کہ مرحوم نے ان سے جو باتیں منسوب کی ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ کتنا پیارا انداز ہے مولانا نعمانی مدظلہٗ رقم طراز ہیں کہ:

بعض حضرات کے متعلق میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک بات ان کے ذہن و خیال میں ہوتی ہے

پھر وہ ایک واقعہ کی طرح ان کے ذہن میں مرتسم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اس کو واقعہ کے طور پر بیان فرما دیتے بلکہ لکھ بھی دیتے ہیں۔ میرا خیال و قیاس ہے کہ ...... کسی رسالہ کے بارے میں مجھ سے متعلق جو بیان فرمایا میں اپنے حافظہ پر پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی کوئی بات مولانا مرحوم کے اور میرے درمیان کبھی نہیں ہوئی۔ میں نے یہ بات میثاق میں پہلی دفعہ پڑھی ہے ـــ میرا خیال ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا خیال فرمایا ہوگا اور پھر وہ واقعہ کے طور پر ان کے ذہن میں قائم ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح کی بات مولانا مرحوم کی کسی اور صاحب سے ہوئی ہو۔ واللہ اعلم!" (مکتوب مولانا نعمانی۔ شائع شدہ میثاق ستمبر ۸۵ء)

مولانا علی میاں مدظلہ کی کتاب "کاروانِ زندگی" کے حوالہ کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ پیش آیا۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم نے اس کتاب کے حوالہ سے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا اس کے متعلق چند احباب نے اس عاجز سے زبانی فرمایا۔ بعض نے خطوط لکھے کہ مولانا مرحوم نے علی میاں مدظلہ کی اس کتاب سے منسوب کر کے جو کچھ فرمایا ایسی کوئی بات کتاب میں موجود نہیں ہے ـــ اس عاجز نے ان آراء کی روشنی میں کتاب حاصل کی اور اس کو بالاستیعاب پڑھا ـــ واقعہ یہی ہے کہ اس میں اس عاجز کو کوئی ایسی بات نہیں ملی ـــ یقیناً اس معاملہ میں مولانا اکبر آبادی مرحوم و مغفور کو کوئی مغالطہ یا تسامح لاحق ہوا ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی کوئی غلط بات کسی نے ان کو سنائی ہو اور عمر کے تقاضے اور پھر قریباً دو ماہ کی مسلسل علالت کے باعث مولانا مرحوم کے ذہن میں یہ بات مرتسم ہو گئی ہو کہ انہوں نے خود اس کو پڑھا ہے ـــــ مولانا مرحوم کے متعلق ہرگز یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے مولانا نعمانی مدظلہ اور مولانا علی میاں مدظلہ سے یہ باتیں دانستہ منسوب کر کے فرمائی ہوں ـــــــــــ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنی رحمت سے مولانا مرحوم کی اس خطا و نسیان کو معاف فرمائے۔ تبلیغی جماعت کے ہمارے بھائیوں کو یقیناً اس سے ذہنی صدمہ ہوا ہوگا۔ ہم ان سے عفو و درگزر کے خواستگار ہیں اور ملتجی ہیں کہ وہ ہمارے اور مولانا اکبر آبادی مرحوم کے حق میں اس فروگذاشت پر بارگاہ رب الرحیم میں عفو و مغفرت کی دعا فرمائیں۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا:

عاصی
اسرار احمد عفی عنہ
۱۲ر اکتوبر ۸۵ء

حالاتِ حاضرہ پر ——
ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی کا
—— ایک مبسوط تبصرہ

قارئینِ " میثاق " کے علم میں یقیناً یہ بات ہو گی کہ امیر محترم انگریزی ماہ کی ہر پہلی سوموار کو کمیونٹی سنٹر آبپارہ اسلام آباد میں دروسِ قرآنِ حکیم اور خطابات کے لیے تشریف لے جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے امیر محترم ۷ / اکتوبر ۱۹۸۵ء اسلام آباد میں تشریف فرما تھے۔ موصوف کے راولپنڈی میں قیام سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے راولپنڈی یونین آف جرنلسٹس (نواز رضا گروپ) نے راولپنڈی پریس کلب میں "MEET THE PRESS" پروگرام میں امیرِ محترم کی شرکت کا اہتمام کیا اس پروگرام میں موصوف نے پہلے سے تیار شدہ بیان پڑھا اور صحافیوں کے سوالات کے جوابات دیے۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کے جملہ اخبارات نے اس پروگرام کی روئیداد شائع کی لیکن اختصار کے ساتھ، راولپنڈی سے باہر کے اخبارات میں امیر محترم کا بیان اور بھی مختصر شائع ہُوا۔ بلکہ بعض اخبارات نے تو محض حوالہ دینے پر ہی اکتفا کیا۔ اس اختصار در اختصار کی وجہ سے اس اہم بیان کے بعض نکات اُجاگر ہونے سے رہ گئے۔ بنا بریں بیان کا مکمل متن قارئینِ " میثاق " کے مطالعہ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے (ادارہ)

سب جانتے ہیں کہ میں معروف معنی میں سیاسی آدمی نہیں ہوں، بلکہ قرآنِ حکیم کا

ایک ادنیٰ طالب علم اور مدرس و مبلغ اور اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ تاہم پاکستان کے ایک شہری کی حیثیت سے بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وطنِ عزیز کے حال اور مستقبل کے بارے غور و فکر کروں اور اس کے ضمن میں جو رائے قائم ہو، اُسی کا برملا اظہار و اعلان کروں۔ اور خاص طور پر دین کے خادم ہونے کے اعتبار سے تو میں اسے اپنا اوّلین اور اہم ترین فرض سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں اسلام کے مستقبل کو "زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر" بنانے کے لیے قولاً اور عملاً جو کچھ کر سکتا ہوں اُس سے دریغ نہ کروں۔

میرے نزدیک استحکامِ پاکستان کا دارومدار دو امور پر ہے:

ایک یہ کہ اس میں اسلام کے فکری و اعتقادی، اخلاقی و عملی اور قانونی و فقہی نظام کو ایک حیاتیاتی وحدت (Organic whole) کی حیثیت سے رائج و نافذ کیا جائے۔ اور ــــ دوسرے یہ کہ اس میں بسنے والوں میں یہ اعتماد اور وثوق پیدا کیا جائے کہ نہ صرف یہ کہ اُن کے جملہ سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق بحیثیت مجموعی محفوظ ہیں بلکہ اُن کے مابین ایک جانب علاقائی اور طبقاتی اور دوسری جانب تہذیبی، لسانی اور ثقافتی سطح پر عدل و انصاف کا معاملہ ہوگا ــــ ان میں سے پہلی چیز کو ہم "نظریۂ پاکستان" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہی قیامِ پاکستان کی واحد وجہ جواز بھی ہے۔ اور استحکامِ پاکستان کی اصل اساس بھی! لیکن دوسرا معاملہ بھی ہرگز کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اصول تو دائمی اور مستقل ہے ہی کہ "ملک با حکومتِ کفر کے ساتھ باقی رہ سکتے ہیں لیکن ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے۔" اور فی الوقت تو اس معاملے نے ملک کی بقاء و سالمیت کی شرطِ لازم کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس کے ضمن میں تین باتیں پیشِ نظر رکھنی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ اسلام کی تعبیر کا حق کسی فردِ واحد کو حاصل ہے۔ نہ ہی یہ چند دانشوروں کو سونپا جا سکتا ہے بلکہ اس ضمن میں اُن علماءِ کرام کے متفق علیہ مؤقف کو اصل اساس کی حیثیت حاصل ہے جن پر دین کے معاملے میں اس ملک میں رہنے والوں کی عظیم اکثریت اعتماد کرتی ہے۔ اگر اس کے برعکس کوئی فردِ واحد طاقت کے بل پر اپنی من مانی

تعبیرات کو عوام پر ٹھونسنا شروع کردے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ عوام کی خاموش اکثریت (Silent majority) کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کرے۔ لیکن پھر وہ محض خاموش تماشائی بن کر رہ جائے گی۔ نہ اُس کے دِل و دماغ سے اِس "اسلامائزیشن" کی بھرپور تائید برآمد ہوگی، نہ اُس کے احساسات و جذبات میں مطلوبہ تحریک (Motivation) پیدا ہو سکے گی۔

دوسرے یہ کہ اسلام کے پورے انفرادی و عائلی، سماجی و معاشرتی، معاشی و اقتصادی، قانونی و دستوری اور سیاسی و حکومتی نظام کو ایک کُل کی حیثیت سے نافذ و لاگو کیا جائے اور نہ اُس کے مختلف اجزاء کے مابین تفریق و تقسیم کی جائے کہ یہ از روئے قرآن (سورۃ البقرہ : آیت نمبر ۸۵) ایک ناقابلِ معافی جرم ہے جس کی سزا بہت سخت ہے، نہ تنفید کے ضمن میں اپنے ذہن کی تراشیدہ ترجیحات کے تحت تدریج کے خوشنما عنوان سے تقدیم و تاخیر کی صورت اختیار کی جائے۔

تیسرے یہ کہ یہ مقصد صرف ایک انقلابی عمل کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے کسی سیاسی یا انتخابی عمل کے ذریعے نہیں، اس لیے کہ بہترین سے بہترین انتخابی عمل بھی پہلے سے قائم شدہ نظام کو بنیادی طور پر تبدیل نہیں کر سکتا بلکہ بنیادی طور پر STATUS QUO کو برقرار رکھتے ہوئے صرف جزوی اصلاحات کر سکتا ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے جو تنظیم "تنظیم اسلامی" کے نام سے قائم کی ہے اُس کی طے شدہ پالیسی یہ ہے کہ وہ وقتی سیاسی و انتخابی عمل سے کنارہ کش رہ کر اپنی ساری توانائیاں مطلوبہ اسلامی انقلاب کے اساسی تقاضوں (Pre-requisites) کی تکمیل کے لیے وقف رکھے گی! اور وقتی سیاسی مسائل پر اظہارِ رائے کی صورت میں صرف فکری رہنمائی فراہم کرنے کی بساط بھر کوشش کرے گی۔

البتہ جہاں تک استحکامِ پاکستان بلکہ پاکستان کے بقا کی دوسری شرطِ لازم کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے ضروری اور لازمی ہے کہ یہاں انتخابی اور سیاسی عمل کو بلا روک ٹوک جاری رکھا جائے۔ تاکہ ملک میں طبقاتی اور علاقائی سطح پر وہ محرومی کا احساس پیدا نہ ہونے پائے جو ملک کے بقاء و وجود کے لیے سمّ قاتل ہے۔ اس لیے کہ اگر خدانخواستہ یہاں کے عوام کو ایک طرف بحیثیتِ مجموعی اپنے سماجی، سیاسی

اور معاشی حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ ملی اور دوسری طرف مختلف علاقائی یا نسلی و لسانی قومیتوں کو عدل و انصاف کی اُمید نہ رہی تو خاکم بدہن یہ ملک ہی باقی نہ رہے گا ـــــ پھر اسلام کہاں نافذ کیا جائے گا ؟

اِس پس منظر میں پاکستان کے دستور سے متعلق جو بحث اس وقت پارلیمنٹ کے اندر اور اس کے باہر ملک کے پورے طول و عرض میں جاری ہے، نہایت اہمیت کی حامل ہے، اس سلسلے میں بھی دو امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے :

ایک یہ کہ اسلام نے موجودہ دَور کے دستوری مسائل میں سے اکثر و بیشتر کے ضمن میں کوئی حتمی اور قطعی احکامات نہیں دیے ہیں۔ "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" کے دستور کو اسلامی بنانے کے لیے "قراردادِ مقاصد" کے ساتھ صرف اُس دفعہ کو صدفی صد واجب التنفیذ اور واجب التعمیل بنا دینا کافی ہے جو ہمارے تمام دساتیر میں رہنما اصول کی حیثیت حاصل رہی ہے جس کی رو سے کوئی بھی قانون سازی جو کتاب و سنّت کے منافی ہو ممنوع قرار پاتی ہے ـــــــــ اس کے سوا جملہ معاملات یعنی یہ کہ نظامِ مملکت وحدانی ہو یا وفاقی اور صدارتی ہو یا پارلیمانی، یا یہ کہ فیڈرل نظام اختیار کرنے کی صورت میں مرکز اور صوبوں کے حدود و اختیارات کا تعین کس طور سے ہو یا یہ کہ پارلیمانی نظام کی صورت میں صدر اور وزیر اعظم کے مابین اختیارات کا توازن کیا ہو ـــ تو یہ سارے اُمور قرآن کی اصطلاح میں "اَمْرُھُمْ" یعنی "لوگوں کا معاملہ" ہیں اور ان کے ضمن میں قرآن نے "شُوْرٰی بَیْنَھُمْ" کا اصول متعین کیا ہے۔ یعنی ان امور کے ضمن میں لوگ خود باہمی مشورے سے جو چاہیں طے کر سکتے ہیں!

دوسری بات جو پہلی بات کا لازمی نتیجہ ہے، یہ ہے کہ ان معاملات میں کسی فردِ واحد کو اپنی مرضی یا فیصلے کو ٹھونسنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ عوام کا معاملہ ہے اور ان ہی کو حق حاصل ہے کہ اپنے نمائندوں کے ذریعے جو فیصلے مناسب سمجھیں کر لیں!

بنا بریں موجودہ صورتِ حال کا بہترین حل تو یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کو من و عن صرف اُس ایک ترمیم کے ساتھ جس کی رُو سے قادیانی غیر مسلم قرار دیئے گئے تھے بحال کر دیا جائے۔ اِس لیے کہ یہ دستور کامل اتفاقِ رائے (Consensus)

کے ساتھ عوام کے اُن نمائندوں نے بنایا تھا جو اُن انتخابات کے ذریعے منتخب ہوئے تھے جس میں کسی جماعت کے حصہ لینے پر پابندی نہ تھی اور جسے پوری دنیا میں منصفانہ اور غیر جانبدارانہ قرار دیا گیا تھا ــــ اور مذکورہ بالا ترمیم بھی دوسری ترامیم کے برعکس حزبِ اقتدار کی اپنی مصلحتوں کے بنا پر نہیں بلکہ شدید عوامی دباؤ کے تحت کی گئی تھی۔ اگر یہ کام موجودہ پارلیمنٹ کے ذریعے سرانجام پا جائے تو یہ اُس کا ملک و ملت پر ایک عظیم احسان ہوگا جسے آئندہ نسلیں تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ یاد رکھیں گی۔ اس صورت میں ضروری ہوگا کہ موجودہ پارلیمنٹ مارشل لاء کے صرف ان اقدامات کو تحفظ دے کر جن کا تعلق ماضی سے ہے اور جن پر عملدرآمد ہو چکا ہے رخصت کر دے اور ۱۹۷۳ء کے دستور کو مذکورہ بالا واحد ترمیم کے ساتھ بحال کر دے اور جلد از جلد اُس کے تحت نئے انتخابات کا انعقاد عمل میں لائے۔

اور اگر ایسا نہ ہُوا تو واحد منطقی راہ یہ رہ جائے گی کہ دستوری مسائل کے حل کے لیے نیا انتخاب ہو اور ان کے نتیجے میں منتخب ہونے والی اسمبلی خواہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں ترمیم کرے خواہ از سرِ نو نیا دستور بنائے۔

یہ دوسرا راستہ، اس میں ہرگز کوئی شک نہیں، کہ نہایت مخدوش ہے لیکن ۱۹۷۳ء کے دستور کو چھیڑنے کی صورت میں اس کے سوا کوئی اور منطقی طریق کار باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے دسمبر ۸۲ء میں جو خط صدر ضیاء الحق صاحب کو لکھا تھا، اُس میں اُن کے "اسلامائزیشن" کے عمل سے اپنی کلی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اُن سے استدعا کی گئی تھی کہ اسلام کے نام پر انتخابی اور سیاسی عمل کو روکے رکھنے اور مارشل لاء کو طُول دینے سے باز آجائیں ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل کا مؤرخ یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے موجودہ دنیا کی جو سب سے بڑی مسلمان مملکت قائم ہوئی تھی، اسے اوّلاً تو ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے نے اور پھر اس کی مزید شکست و ریخت (Balkanisation) کا معاملہ سرانجام پایا ایک نمازی اور پرہیزگار انسان کے ہاتھوں! ساتھ ہی میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر آپ غیر جماعتی انتخاب ہی کا فیصلہ کیے ہوئے ہیں تو اِن کا انعقاد تشکیلِ حکومت کے لیے نہ ہو بلکہ دستوری مسائل کے ضمن میں اختلافات کے حل کے لیے

بقیہ صـ۵۷ پر

نزلہ، زکام اور کھانسی

سے محفوظ رہنے کی آسان تدبیر

مناسب احتیاط برتئے۔ بروقت سُعالین لیجیے

جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ سُعالین کا باقاعدہ اور بروقت استعمال گھر کے ہر فرد کو نزلہ، زکام اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک دو ٹکیاں روزانہ چوسیے۔

سُعالین کے چار قُرص تیز گرم پانی میں گھول لیجیے، جوشاندہ تیار ہے جو نزلہ، زکام اور کھانسی کے لیے بدرجہا مفید ہے۔ ایسی ایک خوراک صبح و شب پیجیے۔

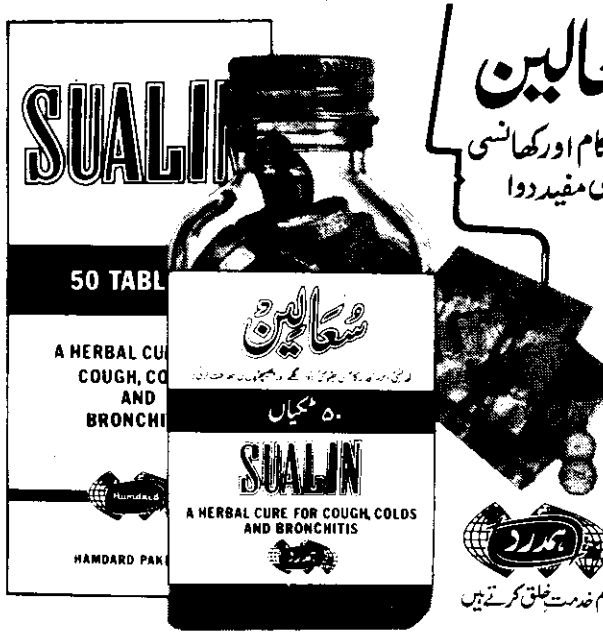

سُعالین

نزلہ، زکام اور کھانسی کی مفید دوا

ہمدرد

ہم خدمت خلق کرتے ہیں

نوزو

ناک کے ورم، سوزش اور بندش کے لیے مفید۔ ایک پھوار ناک کھول دیتی ہے۔

اوازاخلاق

وقت ایسی زمین ہے جس میں محنت کے بغیر کچھ نہیں پیدا ہوتا۔

Adarts SUA-2/84

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۴)

صبرِ محض سے اقدام تک (قسط ۲)

امیر تنظیمِ اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

سیرتِ مطہرہ میں اقدام کا مرحلہ کب آیا؟ ان تمہیدی باتوں کے بعد میں سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا وہ دور آپ حضرات کے سامنے لا رہا ہوں کہ جس میں یہ صبرِ محض (Passive Resistence) کا مرحلہ تبدیل ہوا راست اقدام (Active Resistence) کی شکل میں ـــــ اور میں یہاں یہ بھی گذارش کر دوں کہ چونکہ میرا احساس یہ ہے کہ سیرتِ مطہرہ کے اس مرحلہ اور اس دور پر تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے بلکہ انقلابِ محمدیؐ کے منہج عملی کی تفہیم کے نقطۂ نظر سے تو اس جانب قطعاً توجہ نہیں دی گئی۔ چنانچہ مجھے اس سلسلے میں ان دنوں میں سیرت النبیؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی قدیم وجدید کم و بیش چھ کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہے۔ ایک نقشہ تو پہلے ہی سے ذہن میں تھا لیکن ظاہر بات ہے کہ تفصیل اور استدلال کے ساتھ اس بات کو آپ کے سامنے رکھنا تھا۔ لہٰذا کتبِ سیرت کے بھرپور مطالعہ کے بعد یہ حقائق میں پیش کر رہا ہوں۔

اصل میں یہ جو راست اقدام کا مرحلہ ہے یا بالفاظِ دیگر نظامِ باطل کو چیلنج کرنے کا جو مرحلہ ہے اس کے متعلق آپ پہلے ہی یہ بات جان لیجئے کہ اس کا تعلق ہجرت کے متصلاً بعد کے زمانے سے ہے بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرحلہ ہجرت کے متصلاً ساتھ ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی ہجرت ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو خیرباد فرما کر عازمِ طرفِ مدینہ ہوئے اسی لمحے یہ مرحلہ شروع ہو گیا۔ اس مرحلہ کے لئے قرآن مجید کی جو متعلق آیات ہیں وہ سورہ حج کی ہیں۔ میں بالکل ابتدار میں ان آیات کی تلاوت کر چکا ہوں۔

فرمایا : اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ
یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے قتال کا اذن عام ہوگیا کہ اب تک انہیں حکم تھا کہ ہاتھ بندھے رکھیں۔ اب ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے، انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے۔ یہاں میں نے تلاوت کی ہے : اُذِنَ۔ ترجمہ ہوگا "اجازت دی گئی"۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ جو حضرات مزید دلچسپی رکھتے ہوں اور وہ تحقیقی مطالعہ کرنا چاہیں گے تو ان کے سامنے یہ باتیں آئیں گی۔ لہٰذا ان کی رہنمائی کے لئے عرض کر دوں کہ اس آیت مبارکہ کی دو معروف قرأتیں ہیں جو اہل سنّت کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ ایک ہے :۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ ۔ دوسری ہے : اَذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتِلُوْنَ ۔ فرق یہ ہے کہ اُذِنَ کی جگہ اَذِنَ اور یُقٰتَلُوْنَ کی بجائے یُقٰتِلُوْنَ ہے۔ ہمارے یہاں یہ دو قرأتیں ہیں۔ ان دونوں کے اعتبار سے مراد میں فرق نہیں آئے گا۔ اوّل الذکر قرأت میں صیغہ مجہول ہے۔ ترجمہ یوں ہوگا "اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونس دی گئی ہے"۔ گویا اس میں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ قریش نے تو کوئی کمی نہیں کی۔ میں نے آپ حضرات کو بتایا تھا کہ جسمانی تشدّد کا سلسلہ سن چار نبوی سے شروع ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم کو آٹھ نو برس ہوگئے ہیں مصائب و شدائد اور مشکلات و تکالیف کو جھیلتے ہوئے قریش کی طرف سے کھلا کھلا ظلم ہو رہا تھا ـــــ انہوں نے تو اہل ایمان پر جنگ ٹھونسی ہوئی تھی۔ لیکن اہل ایمان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ان کو جوابی کارروائی کرنے کی اجازت نہیں تھی مگر اب ان کے ہاتھ بھی کھولے جاتے ہیں۔ ان کو بھی اجازت ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ اَذِنَ اور یُقٰتِلُوْنَ یعنی معروف کے صیغہ میں قرأت کی جائے تو ترجمہ ہوگا : "اللہ نے اجازت دے دی ہے اہل ایمان کو کہ جو جنگ کر رہے ہیں (اللہ کی راہ میں)"۔ اس ترجمہ سے ایسا ظاہر ہوگا کہ شاید یہ آیت جنگ کے دور کے شروع ہونے کے بعد نازل ہوئی ہے ـــ چنانچہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ ۲ھ کے ماہ صفر میں نازل ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اگر یُقٰتِلُوْنَ پڑھیں گے تو مطلب ہوگا کہ گویا صحابہؓ کی طرف سے جنگ کا آغاز ہو چکا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توثیق کی جا رہی ہے۔ اگر پہلا ترجمہ کریں گے تو گویا یہ پیشگی اجازت ہوگی بغیر صحابہ کے اقدام کے۔ یہاں یُقٰتَلُوْنَ سے مراد ہوگا قریش کا وہ سارا رویہ جو ہجرت تک رہا۔ میرا ایک وجدانی خیال ہے وہ میں عرض کر دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ یہ آیات نازل ہوئی ہیں اثنائے سفر ہجرت میں۔ سفر میں کم از کم ۷۰ دن لگے ہیں اور ۱۲ ربیع الاوّل ۱ھ کو حضورؐ کا مدینہ منورہ میں ورود مسعود ہوا ہے۔ اس اعتبار سے ۱۲ ربیع الاوّل کی تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہی حضورؐ کی تاریخ وفات ہے۔

اب آیت کا اگلا حصّہ دونوں ترجموں کے ساتھ کہ " چونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور یقیناً اللہ ان کی نصرت و مدد اور حمایت پر قادر ہے "

اسی آیت کے متصلاً بعد والی آیت میں فرمایا : اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ۔ " یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے۔ محض اس جرم اور قصور کی پاداش میں کہ وہ کہتے ہیں کہ " ہمارا رب اللہ ہے " اس آیت مبارکہ کے بعد والے حصّہ کا ترجمہ اور شرح وقت کی کمی کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں۔ یہ سورۂ حج کی چالیسویں آیت ہے۔ اس کا آپ خود مطالعہ کر لیجئے گا۔ اس سلسلۂ آیات کا اختتام ہوتا ہے اس عظیم آیت پر کہ:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝

" یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکّن و اقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے "

اس آیت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ مدینہ منوّرہ میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو جو تمکن فی الارض عطا کیا جانے والا تھا اور اس میں جو توسیع ہونیوالی تھی تو یہ آیت گویا حزبُ اللہ اور اسلامی انقلاب کے منشور (Manifesto) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے آج کل کوئی سیاسی جماعت الیکشن میں حصّہ لیتی ہے تو اپنا ایک منشور شائع کرتی ہے کہ اگر ہمیں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو ہم کیا کریں گے اور ہمارا رویّہ کیا ہوگا۔ یہاں یہ Divine Manifesto نبی اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو دیا جا رہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط مفہوم ہوا کہ اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلم) آپ مدینہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ جہاں آپؐ کا داخلہ ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہوگا۔ تو آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہؓ کے لئے یہ منشور ہے جسے رُوبعمل لایا جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ پسِ ہجرت کا واقعہ اور ہجرت کے ساتھ ہی ان آیات کا نزول یہ ہے درحقیقت قرآن مجید میں وہ Land Marks جہاں سے صورت تبدیل ہو رہی ہے۔ اب تک صبر محض تھا۔ اب اس صبر کے ساتھ مصابرت بھی ہوگی۔ اب تک صرف

جہاد تھا، اب جہاد کے ساتھ قتال بھی ہوگا۔ اب تک تم صرف جھیل رہے تھے، برداشت کر رہے تھے۔ اب تمہیں اجازت دی جا رہی ہے کہ تم جوابی کارروائی بھی کرو اور بدلہ بھی لو۔

اب میں سیرت کے وہ واقعات آپ حضرات کو سنانا چاہتا ہوں جو ہجرت کے بعد غزوۂ بدر سے قبل دو برس میں وقوع پذیر ہوئے۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ میں ۱۲ ربیع الاوّل ۱ھ میں ورود مسعود ہوا۔ چھ مہینے تک تو حضورؐ نے نہ کوئی جوابی کارروائی فرمائی نہ مکّہ کی طرف کوئی اقدام کیا۔ بلکہ یہ چھ مہینے استحکام کے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے حالات ایسے بنا دیئے تھے کہ حضورؐ کو تو خود مدینہ سے دعوت ملی تھی کہ آپ یہاں تشریف لائیے۔ یہاں آکر آپؐ کو دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مدینہ میں اوس و خزرج کے دو بڑے قبیلے آباد تھے۔ دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اور رؤسا حضورؐ پر ایمان لا چکے تھے اور ان میں سے اکثریت بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت موجود تھی اور حضورؐ کے دستِ مبارک پر دو سال قبل بیعت کر چکی تھی۔ لہٰذا آپؐ نے استحکام کے لئے چھ ماہ صرف فرمائے ہیں اور اس عرصہ میں کئے جانے والے تین اقدامات بہت اہم ہیں۔

مدینہ میں حضورؐ کے اقدامات بغرضِ استحکام پہلا فوری اقدام اقامتِ صلوٰۃ سے متعلق تھا۔ اس لئے کہ منشورِ الٰہی کی پہلی شق یہی ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے پہلا کام جو کیا وہ تھا مسجدِ نبوی کی تعمیر۔ اس کے لئے جگہ کا انتخاب پھر اس کا حصول۔ پھر تعمیر کا آغاز۔ اس تعمیر کا یہ پہلو ضرور سامنے رکھئے کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں بنفسِ نفیس شریک رہے ہیں۔ گارا اٹھا کر دے رہے ہیں، پتھر اٹھا کر دے رہے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ آپؐ نے ایک مزدور اور کارکن کی حیثیت سے مسجدِ نبوی کی تعمیر میں حصّہ لے کر اپنے آباء و اجداد کی سنّت کی تجدید فرمائی۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ۔ بیت اللہ کی دیواریں اٹھائی تھیں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے علیہما الصّلوٰۃ والسّلام۔ تو مسجدِ نبوی کی تعمیر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توانائیاں اور آپؐ کی محنت کا پسینہ بھی اس کے گارے میں شامل تھا۔

دوسرا اقدام جو آپؐ نے فرمایا اس کا عنوان ہے مؤاخات۔ یہ بہت بڑا کام تھا۔ مہاجرین کو مدینہ کی آبادی میں مدغم (Integrate) کرنا۔ تاکہ وہ اس

معاشرہ میں علاحدہ طبقہ کی حیثیت سے نہ رہ جائیں۔ بلکہ اس کا ایک جزو لاینفک بن جائیں۔ مہاجرین میں جو اہم لوگ تھے ان کے بالکل سگے بھائیوں کی طرح انصار کے ساتھ رشتے کرادیئے گئے۔ مواخات کا یہ اقدام داخلی استحکام کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مواخات کا یہ معاملہ سیرتِ مطہرہ کے ابواب میں ایک نہایت اہم باب ہے۔ ایسی کوئی دوسری مثال شاید ہی تاریخ سے مل سکے۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ انبیاء و رسل کی تاریخ میں ایسے واقعات ہوئے ہوں جو ہمارے علم میں نہ ہوں لیکن معلوم تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ انصار نے مہاجرین کے لئے اپنے گھر تقسیم کر دیئے۔ دو کانیں تقسیم کر دیں۔ ایک انصاری صحابی کے بارے میں یہاں تک آتا ہے کہ ان کی دو بیویاں تھیں۔ وہ اپنے مہاجر بھائی کو گھر میں لے گئے۔ چونکہ اسوقت تک حجاب کا حکم نہیں آیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے پیش کش کی کہ ان میں سے جو تمہیں پسند ہو میں اسے طلاق دیتا ہوں۔ آپ اس سے نکاح کرلیں۔ اس لئے کہ میں یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ میرے گھر میں دو دو بیویاں ہوں اور میرے بھائی کا گھر آباد نہ ہو۔ یہ مواخات بھی نہایت انقلابی اہمیت کا حامل اقدام ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کی سرشت کے اندر جو کمزوریاں ہیں اس میں طبقاتی تفاوت و امتیاز اور کشمکش بہت خوفناک ہوتی ہے۔ اوس و خزرج میں قبائلی و طبقاتی کشمکش اور عصبیت پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اسلام اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنفسِ نفیس ورودِ سعید نے اس کو ختم کیا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ عرصہ بعد ہی منافقین اور یہود کسی نہ کسی بہانہ سے اس چنگاری کو بھڑکانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی طریقہ سے اگر مہاجرین اور انصار کا اس طرح ادغام و انضمام نہ کردیا گیا ہوتا۔ ان کے مابین مواخات قائم نہ کردی گئی ہوتی تو ہوسکتا تھا کہ بہت سی داخلی مشکلات پیدا ہوجاتیں۔ منافقین اور یہود نے اس کی موقع بموقع کوششیں کیں لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست، تدبر، معاملہ فہمی اور حکمت نے ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

جو تیسرا اقدام حضورؐ نے مدینہ میں استحکام کے لئے فرمایا وہ یہودیوں کے ساتھ معاہدوں سے متعلق تھا جن کے تین قبیلے مدینہ میں آباد تھے اور وہ بہت اہم، بااثر اور طاقتور تھے۔ مدینہ کے اقتصادی شعبہ پر ان کا بڑا تسلط (Hold) تھا۔ ان کی قلعہ نما گڑھیاں تھیں ان میں کافی اسلحہ جمع تھا، ساز و سامان جمع تھا۔ بالکل صورت حال وہ تھی جس کی میں کئی بار مثال دیتا رہا ہوں کہ جیسے غیر منقسم ہندوستان میں ہم دیکھتے تھے کہ گاؤں تو مسلمانوں کا ہے لیکن

جو تین چار گھر بنیوں کے ہوتے وہ پکی حویلیوں کی صورت میں ہوتے تھے۔ باقی مسلمانوں کے گھر کچے ہوتے تھے۔ ہندو بنیوں کے پاس سرمایہ ہوتا تھا اور گاؤں بھر کے مسلمان ان کے سودی قرضوں میں بندھے ہوتے تھے۔ ان کے گھر اور کھیت ان بنیوں کے پاس رہن ہوتے تھے۔ تو یہی کچھ معاملہ اس وقت مدینہ میں تھا۔ اگرچہ یہود اصل مالکانِ دہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ مالکانِ دہ تو اوس و خزرج تھے لیکن سرمایہ، تنظیم، تعلیم یہ چیزیں یہود میں بہت زیادہ تھیں اور وہ بہت مؤثر عامل کی حیثیت سے وہاں موجود تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دور اندیشی کا یہ شاہکار ہے کہ آپؐ نے مدینہ تشریف لے جاتے ہی فوراً یہود کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ میں نے 'جکڑنے' کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ ان سے معاہدہ میں طے پا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔ ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے۔ اور اگر کبھی مدینے پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کے حلیف کی حیثیت سے ساتھ دیں گے یا بالکل غیر جانب دار رہینگے۔ وہ اس معاہدے میں ایسے بندھ گئے کہ وہ کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آ سکے۔ اگرچہ بعد میں اسلام کی اشاعت اور استحکام کو دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹتے رہے۔ اور اگرچہ پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہے اور ان کی مشرکین قریش سے ساز باز تھی۔ لیکن یہ سب چوری چوری ہو رہا تھا۔ علی الاعلان مقابلہ میں نہیں آ سکتے تھے۔ اسی لئے میں نے اس کیفیت کو جکڑ بندی سے تعبیر کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں کا پابند بنانے کے لئے جو اقدام فرمایا وہ ہر لحاظ سے دور اندیشی اور فراست و ذہانت کا ایک شاہکار تھا۔ اس اقدام نے اسلامی تاریخ میں نہایت اہم اور مثبت کردار ادا کیا ہے۔ اور بلاشبہ یہ نہایت اہم اقدام تھا۔

راست اقدام کا مرحلہ

بہرحال یہ چھ مہینے ہیں۔ ربیع الاول سے لے کر رمضان سنہ ۲ھ تک کہ اس دوران آپؐ نے کوئی مہم باہر نہیں بھیجی۔ یہ چھ مہینے آپؐ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے اور ہجرت کی وجہ سے اسلامی انقلابی جماعت کے جو دو عناصر ہو گئے تھے، یعنی مہاجرین و انصار، ان کو باہم شیر و شکر کرنے اور بنیانِ مرصوص بنانے میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد راست اقدام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے ـــــ وہ مرحلہ کیا ہے؟ اس کو صرف تاریخی اعتبار سے سمجھنے کے بجائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاجِ انقلاب کے نقطۂ نظر

سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ حضورؐ نے آٹھ فوجی مہمیں مکہ کی طرف روانہ فرمائیں۔ جن میں سے چار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ لہٰذا انہیں غزوات کہا جاتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ وہ غزوات ہیں جو غزوۂ بدر سے پہلے کے ہیں۔ عام طور پر ہمارا جو تصوّر اور تاثر ہے وہ یہ ہے کہ پہلا غزوہ، غزوۂ بدر ہے۔ پہلی باقاعدہ جنگ یقیناً غزوۂ بدر ہے ـــــ غزوہ عربی میں کہتے ہیں اللہ کی راہ میں نکلنے کو اور غزوہ خاص ہوگیا اس مہم کے لئے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس نکلے ہوں۔ تو ابتدائی چھ ماہ کے بعد چار فوجی مہمیں وہ ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ سے باہر نکلے۔ اور چار سرایا ہیں۔ سریہ اس فوجی مہم کو کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے کوئی مہم بھیجی یا کوئی لشکر روانہ فرمایا اور کسی صحابی کو اس کا سربراہ یا سپہ سالار مقرر فرما دیا۔ خود آپؐ اس میں شامل نہیں ہوئے۔ ان آٹھ مہموں کے حالات و واقعات کو ہمارے اکثر سیرت نگار اور مورخین نے بمشکل تمام دو یا تین صفحات میں سمیٹ لیا اور اس میں بھی نہایت ایجاز و اجمال سے کام لیا۔ حالانکہ یہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کا وہ اہم اور نازک (Critical and crucial) مرحلہ جس میں اقدام اب حضورؐ کی طرف سے ہو رہا ہے؛ پیش قدمی اب حضورؐ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یا بالفاظ دیگر صبر محض (Passive Resistence) اب 'راست اقدام' (Active Resistence) میں تبدیل ہو رہا ہے۔

اب میں چاہوں گا کہ پہلے آپ کو جدید اصطلاحات میں بات سمجھا دوں کہ اس راست اقدام (Active Resistence) کی نوعیت تھی کیا؛ اصل میں حضورؐ نے مکہ کے خلاف جو اقدام کیا اس کے دو مقصد سامنے آتے ہیں جو جدید اصطلاحات کے حوالہ سے سمجھ میں آئیں گے۔ پہلا مقصد جس کو آج کل کہا جاتا ہے ' Economic Blockade ' یعنی معاشی ناکہ بندی؛ آپ کو معلوم ہے کہ مکہ کی اور قریش کی معاشی زندگی کا دار و مدار تجارت پر تھا۔ مکہ کا اپنا حال تو یہ تھا کہ جسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے " بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ " وہاں کسی نوع کی پیداوار تھی ہی نہیں۔ وہ تو کھانے پینے کی چیزوں کے لئے باہر کی منڈیوں کے محتاج تھے۔ وہاں ایک دانہ تک نہیں اگتا تھا۔ ہاں بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے، ان کا دودھ اور گوشت البتہ انہیں حاصل تھا لہٰذا ان کی معیشت کا سارا دار و مدار تجارت پر تھا اور درحقیقت اس دور کی مشرقی اور مغربی ساحلوں کے مابین تجارت میں قریش کو ایک اہم کڑی اور واسطہ (Link) کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ آپ غور کیجئے کہ آج کل نہر سوئیز کی کتنی اہمیت ہے۔ کچھ عرصہ کے لئے بند ہوجائے

تو تجارت کا کیا حال ہو جائے گا۔ حالانکہ دوسرے راستے موجود ہیں جو طویل پڑیں گے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن جس زمانہ میں کوئی اور راستہ تھا ہی نہیں۔ یہ جنوبی افریقہ سے ہندوستان اور مشرقی ایشیا سے بحری راستے تو پندرھویں صدی عیسوی میں دریافت ہوئے ہیں۔ لہٰذا مشرق و مغرب کی تجارت حضورؐ کی بعثت کے دور میں عرب کے راستہ سے ہوتی تھی ــــ ہوتا یہ تھا کہ ہندوستان، انڈونیشیا، ملائشیا اور دوسرے مشرقی ممالک کا سارا سامانِ تجارت بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے یمن کے ساحل تک پہنچتا تھا۔ ادھر مغرب کے ممالک یعنی یونان، اٹلی اور بلقان کی ریاستوں کا سارا سامانِ تجارت شام کے ساحلوں پر اتر جاتا تھا۔ اس طرح یورپ کے ممالک کا سامانِ تجارت بحیرہ روم سے ہو کر ادھر پہنچتا تھا اور اُدھر بحیرہ عرب اور بحرۂ ہند سے ہو کر مشرقی ممالک و جزائر کا سامانِ تجارت یمن پہنچ جاتا تھا۔ اب ان کے مابین کاروبار کی جو ساری نقل و حمل (Shuffling) تھی وہ صرف قریش کے ہاتھ میں تھی۔ جس کا قرآن مجید میں سورۃ قریش میں بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا گیا ہے :-

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝ قریش ــــــ سردیوں میں سفر کرتے تھے یمن کی طرف اُدھر ان کے قافلے جاتے تھے اور گرمیوں میں ان کے قافلے شمال یعنی شام کے ساحلوں کی طرف سفر کرتے تھے۔ ایک بڑا تجارتی سفر سردیوں میں اور ایک بڑا تجارتی سفر گرمیوں میں ان کے معمولات میں شامل تھا اور انہیں ان دونوں اسفار میں مکمل امن حاصل رہتا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ آخر عرب کے دوسرے قبائل بھی اس کاروبار میں حصّہ لیتے تھے۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ ان کے قافلے اکثر لوٹ لئے جاتے تھے۔ چونکہ عرب کے اکثر قبائل کا تو پیشہ ہی لوٹ مار، رہزنی اور غارت گری تھا۔ تو کسی اور قبیلہ کا قافلہ شاذ ہی لوٹ مار سے بچ کر نکلتا تھا۔ سوائے قریش کے۔ ان کے قافلہ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ ایسا کیوں تھا! اس لئے کہ قریش کعبہ کے متولّی تھے اور تمام عرب اسے اللہ کا گھر تسلیم کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ سارے کے سارے قریش کے تو نہیں تھے۔ بلکہ صورت یہ تھی کہ تمام عرب قبائل کے "خدا" قریش کے پاس بطور یرغمالی (Hostages) رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے قافلہ کے اوپر کوئی قبیلہ ہاتھ ڈالے تو قریش اس قبیلہ کے "خدا" کی گردن مروڑ دیں گے کہ نہیں! یہ وجہ تھی کہ قریش کے قافلوں کو تحفظ حاصل تھا ــــــ سورہ قریش میں آگے فرمایا گیا: فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ بدبختو! تمہیں اللہ کے اس گھر کی وجہ سے رزق مل رہا ہے اور تم نے اس کی حرمت کو بٹہ لگا رکھا ہے۔ تم پر

تو لازم ہے کہ اس گھر کے مالک اللہ واحد کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو بھوک سے نجات دلا رکھی ہے۔ اور خوف سے محفوظ رکھا ہے۔

تو اس منظر کو سامنے رکھئے کہ مغرب و مشرق کی تجارت میں قریش کو بلا شرکت غیرے اجارہ داری (Monopoly) حاصل تھی۔ اس وجہ سے کہ یہ کعبہ کے متولی تھے اور کعبہ میں تمام قبیلوں کے بت رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے قافلوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ ڈالنا شروع فرمایا۔ یہ بات خوب اچھی طرح نوٹ کیجئے۔ آپؐ نے اب ایک قوت کے اعتبار سے اپنی موجودگی (Presence) ثابت فرمادی ۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ کون سی مہمیں ہیں جن کے ذریعے سے حضورؐ نے اقدام فرمایا۔ اس اقدام کا مقصد کیا تھا! سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مقصد تھا مکّہ کی معاشی ناکہ بندی یعنی (Economic blockade) حضورؐ نے درحقیقت قریش کی رگ جان (Life-line) پر ہاتھ ڈالا، ان کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنا دیا اور انکی معاش کے لئے ایک خطرہ کھڑا فرمادیا۔ چنانچہ ایک مقصد تو تھا معاشی ناکہ بندی اور دوسرا مقصد تھا قریش کی سیاسی ناکہ بندی جس کو کہا جائے گا ' Isolation of Quresh ' ــــــ یا (Political containment of Quresh) ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس علاقے میں جو دوسرے قبیلے آباد تھے ان کے قریش سے معاہدے تھے، وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ حضورؐ نے اس علاقے میں متعدد سفر کئے، اپنی قوت کا بھی مظاہرہ فرمایا اور اپنی تبلیغ و دعوت کو بھی استعمال فرمایا۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ وہ جو اقبال نے کہا ؎ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد ــــ تو تبلیغ و دعوت بھی ہے اور اس کے ساتھ طاقت بھی شامل ہو جائے تو اب یوں سمجھئے کہ جیسے سونے پر سہاگہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں ہجرت کا ذکر آ رہا ہے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا تلقین کی گئی تھی: وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا ۝ "اے اللہ! جہاں تو مجھے داخل کرنے والا ہے وہاں میرا داخلہ سچائی اور راست بازی کے ساتھ ہو اور جہاں سے تو مجھے نکال رہا ہے سچائی اور راست بازی کے ساتھ نکال۔ اور پروردگار خاص اپنے خزانۂ فضل سے قوت و طاقت کے ساتھ میری مدد فرما"۔ یہ ہے وہ قوت و طاقت جو حضورؐ کو مدینہ میں تشریف لانے کے بعد حاصل ہو گئی تھی ــــ تو اب حضورؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ نکلتے تھے، کسی قبیلہ میں جا کر آپ نے دس بیس دن قیام فرمایا، ان کے ساتھ معاہدے کئے، اوّل تو ان کو اپنا حلیف بنا لیا ورنہ کم از کم انہیں غیر جانب دار ضرور بنا لیا کہ اگر تمہارا معاہدہ قریش کے ساتھ ہے تو ہمارے

ساتھ بھی کرو۔ ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کرو اور ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرو۔ بالکل غیر جانب دار (Neutral) ہو جاؤ۔ یہ ہیں حضورؐ کے وہ اقدامات جن کو میں جدید اصطلاحات کے حوالے سے Isolation and Political containment of Quresh قرار دیتا ہوں۔

ان مقاصد کے لئے چار سفر تو حضورؐ نے بنفس نفیس فرمائے اور چار مہمیں ایسی ہیں کہ جن میں آپ شریک نہیں تھے۔ یہاں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ ان مہموں میں آپؐ نے کسی انصاری صحابی کو شامل نہیں فرمایا۔ یہ جملہ مہمیں مہاجرینؓ پر مشتمل تھیں۔ اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ تھی کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصارؓ نے عرض کیا تھا کہ "آپؐ مدینہ تشریف لے آئیے۔ اگر قریش نے آپؐ کی وجہ سے مدینہ پر حملہ کیا تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں۔" دوسری خاص بات یہ کہ کل ایک سال کے اندر یہ ساری کارروائی عمل میں آ گئی۔ یعنی رمضان ۱ھ سے لے کر رمضان ۲ھ تک کے عرصہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ مہمیں سرانجام دیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس قدر کم وقت میں کس قدر شدّ و مد اور زور و شور کے ساتھ یہ عمل تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ کمر بستہ گاڑیوں پر آپؐ نے کوئی مہم بھیجدی ہو۔ بلکہ یہ تمام مہمیں اونٹوں کے ذریعے یا پاپیادہ طے کی گئیں

میں ان آٹھ مہموں کی تفصیلات سیرت کی متعدد کتب (Consult) کر کے نوٹ کر کے لایا ہوں اور کافی محنت سے میں نے مختلف کتابوں سے ان کو مرتب کیا ہے اور ان مہمات کے مقاصد اور ان کی غرض و غایت کو سمجھا ہے۔ جو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ سیرت نگاروں نے ان مہمات کا بہت ہی سرسری طور پر ذکر کیا ہے اور اس مقام سے ایسے گزر گئے ہیں کہ جیسے یہ سیرت کے غیر اہم واقعات تھے۔ ان کے یہاں ہجرت کے بعد پہلا قابل ذکر واقعہ غزوۂ بدر ہے حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ غزوہ بدر کیوں ہوا! غزوۂ بدر سے تو اصل میں حضورؐ کی انقلابی جدوجہد آخری اور چھٹے مرحلے (Final and sixth phase) میں داخل ہوئی ہے۔ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) ۔ لیکن Passive Resistence (یعنی صبر محض) ہجرت کے بعد Active Resistence (یعنی راست اقدام) کی شکل میں کیسے بدلی! جس کے نتیجہ میں مسلح تصادم کی نوبت آئی۔ یہ ہے وہ تقریباً ڈیڑھ دو سال کی تاریخ جس پر غور و تدبر سے حضورؐ کا منہج انقلاب صحیح طور پر سمجھ میں آ سکے گا اور یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ حضورؐ

کو تلوار کیوں اٹھانی پڑی۔ اس دو سال کی تاریخ کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ حضورؐ نے قریباً چھ مہینے لگائے ہیں داخلی استحکام (Consolidation) کے عمل میں۔ اس کے بعد پہلے چھ مہینوں میں تین مہمات آپ نے بھجوائیں جن میں آپ خود تشریف نہیں لے گئے۔ بعد کی شش ماہی کی چار مہموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ ان مہمات کے دو مقاصد تھے۔ پہلا مقصد تھا مکہ کی معاشی ناکہ بندی اور دوسرا قریش کو سیاسی طور پر Isolate کرنا یعنی مکہ اور مدینہ کے درمیان کے علاقہ میں جو قبائل آباد ہیں یا تو ان کو اپنا حلیف بنا لینا، ان کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کر لینا یا کم از کم یہ کہ ان کو غیر جانبدارانہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر راضی کر لینا کہ وہ نہ قریش کا ساتھ دیں اور نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیں بلکہ قطعی غیر جانبدار ہو جائیں ـــــ ان آٹھ مہموں کو ترتیب وار بیان کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ دو واقعات آپ کو اور سنا دوں۔

ہوا یہ کہ پہلے چھ مہینوں میں جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی کوئی اقدام نہیں فرمایا تھا ایک واقعہ پیش آیا جو بہت اہم ہے۔ حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رئیس اوس، مکہ گئے۔ ابھی تک مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے مابین کھلا اعلانِ جنگ (War Declare) نہیں ہوا تھا مکہ میں حضرت سعدؓ کا حلیف امیہ ابنِ خلف تھا جو کبھی حضرت بلالؓ کا آقا ہوا کرتا تھا۔ اور اس نے ان کو بہت ستایا تھا۔ حضرت سعدؓ نے ان کے یہاں قیام کیا اور پھر طواف کے لئے حرم گئے۔ وہاں ابوجہل سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس نے امیہ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں! اس نے بتایا کہ یہ اوس کے رئیس سعد ابن معاذؓ ہیں۔ ابوجہل انؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا۔ اور اس نے کہا کہ "اگر تم امیہ کے حلیف نہ ہوتے تو تم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ تم ہمارے دشمنوں اور بے دینوں کو پناہ دو اور خود آ کر بیت اللہ کا طواف کرو"۔ اس کے نزدیک تو نعوذ باللہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی بے دین تھے۔ چونکہ انہوں نے قریش کا بت پرستی کا آبائی دین چھوڑ دیا تھا۔ حضرت سعد ابن معاذؓ نے اسی وقت ترکی بہ ترکی جواب دیا "اگر تم نے ہم پر طواف بند کیا تو جان لو کہ ہم تمہارے تجارتی راستوں کو روک دیں گے"۔ یہ واقعہ سیرت النبیؐ میں موجود ہے ـــــ دیکھئے ان واقعات سے حقائق کو سمجھنا ضروری ہے۔ کہ کس طرح انقلابِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا منہاج مختلف مراحل سے گزرا ہے ـــــ حقائق اور واقعات کو اس طرح سمجھنا چاہیئے جیسے وہ پیش آئے ہیں۔ اور اُن سے جو نتائج مترتب ہوئے ہیں ان پر غور کرنا چاہیئے ـــــ میں نے کئی بار سیرت کی تقریروں میں یہ بات عرض کی ہے کہ سیرت

مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس میں معجزوں کا دخل بہت کم نظر آتا ہے۔ سیرتِ مبارکہ بغور مطالعہ کیجئے تو آپ کو روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت نظر آئے گی کہ حضورؐ کے منہجِ عمل میں انسانی جدوجہد (Human Efforts) محنت، کوشش، کشاکش، کشمکش، ایثار و قربانی، صبر و مصابرت، جہاد و استقامت کے عناصر غالب نظر آئیں گے۔ میں اپنی اس بات کی مزید وضاحت کے لئے کہا کرتا ہوں کہ یہ سارا عمل زمین پر قدم بقدم چل کر مصائب و شدائد جھیل کر، قربانیاں دے کر انجام دیا گیا ہے۔ انقلابِ محمدی کا یہ سارا راستہ اور فاصلہ انسانی سطح پر ان تمام مرحلوں سے گزر کر طے کیا گیا ہے جو ہر انقلابی عمل کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار حسی معجزات، کرامات اور خرقِ عادت واقعات ہیں، حضورؐ کے دستِ مبارک سے متعدد بار عظیم ترین برکات کا ظہور ہوا ہے ــــ لیکن اس انقلابی جدوجہد میں ان کا کتنا کچھ دخل ہے۔ اس اعتبار سے کبھی سوچئے گا اور اس نقطۂ نظر سے سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کیجئے گا تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے جس پر میں پہنچا ہوں کہ درحقیقت اس میں غالب ترین عنصر انسانی سطح کی جدوجہد کا نظر آئے گا جس میں مشکلات ہیں، مصائب ہیں، جور و ستم ہے، تعدی و ظلم ہے۔ شدائد ہیں۔ خود محبوبِ رب العالمین کے لئے، قید و بند اور معاشی مقاطعہ ہے۔ رحمۃ للعالمین پر پتھروں کی بارش ہے۔ جس سے جسمِ اطہر سے اتنا خون بہا ہے کہ نعلین مبارک پیروں میں جم گئے ہیں۔ زخموں سے چور اور نڈھال ہو کر آپؐ طائف کی گلیوں میں کئی بار گرے ہیں اور ظالموں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پھر کھڑا کر دیا ہے۔ اور چلنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ سب کچھ خود آپؐ کے ساتھ ہوا ہے لیکن نہ دشمنوں کے ہاتھ شل ہوئے اور نہ وہ زمین میں دھنسا دئے گئے ــــ ایسا کیوں ہوا! اس کی بھی وجہ ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مراحل سے گزر کر اللہ کا دین غالب فرمایا جزیرہ نما عرب پر۔ اب حضورؐ کی امت کو اللہ کا یہ دین غالب کرنا ہے پوری دنیا پر۔ ــــ تو اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ جدوجہد معجزوں کے ساتھ کامیاب اور غالب ہوتی ہوتی۔ تو معجزے بعد والوں کے لئے بھی ہونے چاہئے تھے۔ حالانکہ معجزہ صرف انبیاء و رسل کے ساتھ مختص ہوتا ہے، امت کے لئے معجزات نہیں ہوں گے۔ یہ بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد وہاں بھی آئی تھی اور جب کبھی بھی حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دین کے غالب کرنے کی جہاں جدوجہد کی جائے گی۔ اللہ کی غیبی مدد یہاں بھی ضرور آئے گی ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو !!!
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

تو اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور نصرت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ لیکن معجزہ! وہ صرف انبیاء و رسل کے لئے مختص ہوتا ہے۔ نبوّت و رسالت کے اختتام کے ساتھ ہی معجزات کا سلسلہ بھی ختم ہوا۔ اب جو بھی کوشش اور جدّوجہد کرنی ہوگی۔ وہ زمین پر قدم بقدم چل کر خالص انسانی سطح پر کرنی ہوگی۔ لہٰذا جناب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی امّت پر یہ حجّت قائم فرما دی کہ آپؐ نے بالکل انسانی سطح پر، زمین پر قدم بقدم چل کر، مصائب و شدائد جھیل کے اور ہر طرح کے موانعات سے نبرد آزما ہو کر جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی انقلاب برپا فرما دیا ـــــ بہر حال یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت سعد ابن معاذؓ کا یہ قول بھی یاد رکھئے۔

دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ ابن ابی خزرج کا بہت بڑا سردار تھا اور اوس و خزرج کے دونوں قبیلے باہمی مشاورت سے اُسے مدینہ کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے لئے تاج بھی تیار ہو گیا تھا۔ اور یہی بات اس شخص کی بدبختی کا اصل سبب بن گئی کہ وہ منافقین کا سردار بن گیا چونکہ اس کی بادشاہت کا آئینہ تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مدینہ میں تشریف آوری کے باعث چکنا چور ہو گیا۔ اب ان بے تاج بادشاہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ورودِ مسعود کے بعد اس باتاج بننے والے کے لئے گنجائش کہاں رہی! وہ ایمان تو لے آیا چونکہ دونوں قبیلے ایمان لے آئے تھے۔ لیکن پہلے ہی دن سے اس کے دل میں جو نفاق کا بیج پڑا تو وہ پروان چڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کے پاس قریش کے خطوط آ رہے تھے کہ تم حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو مدینہ سے باہر نکالو۔ تم کھڑے ہو جاؤ۔ تمہیں اقدام کرنا چاہیے۔ ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم لشکر لے کر آنے کے لئے تیار ہیں وغیرہ وغیرہ ـــ اس کی یہ ریشہ دوانیاں ابتدا ہی سے شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے استحکامات کے متعلق جو تین اقدامات آپ کو گنوائے تھے ان میں چوتھا یہ بھی شامل کیجئے کہ آپؐ بنفسِ نفیس چل کر عبداللہ ابن ابیّ کے پاس تشریف لے گئے۔ حالانکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حضورؐ اس کو طلب فرماتے اور خود انتظار فرماتے۔ لیکن نہیں۔ معاملہ دین کا ہے۔ اس میں کسی کی کوئی ہیٹی نہیں ہو جاتی۔ چاہے وہ رسول ہو۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ وہ جو غالبؔ نے کہا ہے کہ ؎ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا ـــــ یہاں دربدر جانا پڑتا ہے ـــــ حضورؐ نے خالص دنیوی انداز اور دلیل سے اسے سمجھایا اور فرمایا دیکھو اگر تم نے کوئی اقدام کیا تو کیا اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ کرو گے! حضورؐ اسے سمجھا رہے ہیں کہ تمہارا سارا قبیلہ ایمان لا چکا ہے۔ اگر تم نے اس طرح کی کوئی حرکت کی جو ہمارے علم میں آئی ہے تو اچھی طرح سوچ

لو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا! تمہیں اپنے بھائی بندوں کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے اسے کوئی عملی اقدام کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اگرچہ وہ ساری عمر سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرتا رہا جیسے یہودی کرتے رہے لیکن اسے کبھی بھی کھلم کھلا سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات

میں نے غزوۂ بدر سے قبل جن آٹھ مہمات کی طرف اشارہ کیا تھا اب ان کی تفصیل سماعت فرمایئے!

رمضان المبارک ۱ھ میں سب سے پہلا سریہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں بھیجا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان مہمات میں آپؐ نے کسی انصاری صحابی کو شامل نہیں فرمایا۔ یہ سریہ تیس مہاجرین پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر ساحل بحر تک پہنچ گیا۔ وہاں ابوجہل تین سو کی نفری کے ساتھ کوئی تجارتی قافلہ لے کر جا رہا تھا۔ دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی لیکن وہاں مجدی ابن عمرو جہنی ایک شخص تھا جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ ہو چکا تھا۔ وہ بیچ میں پڑ گیا اور اس نے کوئی مسلح تصادم نہیں ہونے دیا۔ کوئی جنگ یا خونریزی نہیں ہوئی ورنہ مقابلہ ہوتا۔ تیس صحابہؓ کا تین سو مشرکین مکہ سے۔ گویا ایک اور دس کی نسبت تھی۔ یہ پہلی مہم تھی جو حضورؐ نے رمضان سن ایک ہجری میں بھیجی تھی۔ اگلے رمضان ۲ھ میں غزوہ بدر ہوا تھا۔ یہ بات تاریخ کے حوالہ سے سامنے رکھئے۔ اس سریہ کے بارے میں تاریخ میں آیا ہے کہ پہلا جھنڈا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند فرمایا ہے وہ اس سریہ کے لئے تھا جو حضورؐ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا تھا۔

دوسری مہم ایک ماہ بعد ہی شوال ۱ھ میں حضرت عبیدہؓ ابن الحارث کی سرکردگی میں مہاجرین کے ساتھ بھیجی گئی۔ اس کا بھی آمنا سامنا ابوسفیان کے ایک قافلہ کے ساتھ رابغ کے مقام پر ہو گیا اور ٹکراؤ کی نوبت آگئی تھی ـــــ اب ذہن میں رکھئے یہ رابغ بھی ساحل بحر پر ہے۔ حج اور عمرہ کرنے والے حضرات اس مقام سے بخوبی واقف ہیں۔ مدینہ کے راستہ میں رابغ بھی آتا ہے۔ آگے چل کر مدینہ سے جو سڑک بدر تک آتی ہے اس پر حاجی حضرات نے بدر کے نزدیک سڑک پر تیر کے نشان دیکھے ہوں گے جو ینبوع کی طرف نشان دہی کرتے ہیں جو اب ایک بڑی بندرگاہ بن گئی ہے ینبوع کا ذکر بھی آگے آئے گا۔ بہرکیف اس موقع پر بھی جنگ نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ابھی تک کسی کی طرف سے بھی باقاعدہ اعلانِ جنگ (War Declare

نہیں ہوا تھا۔ حضورؐ کا مقصد اصل میں یہ تھا کہ اپنی موجودگی (Presence) ثابت کردیں۔ کہ اب یہ تجارتی راستہ تمہارے لئے پہلی کی طرف محفوظ و مامون نہیں ہے کہ بے کھٹکے گزرتے رہو۔ بلکہ یہ اب ہماری زد میں ہیں۔ اس موقع پر پہلا تیر چلایا حضرت سعد ابن ابی وقاص نے رضی اللہ تعالیٰ عنہ ـــــ یہ دو باتیں خاص طور پر نوٹ کر لیجئے کہ ہجرت کے بعد پہلا جھنڈا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ کا جو آپؐ نے پہلی مہم کے موقعہ پر حضرت حمزہؓ کو عطا کیا تھا۔ ہجرت کے بعد جو پہلا تیر چلایا گیا وہ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے چلایا اگرچہ اس سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ یہاں بھی بیچ بچاؤ ہو گیا اور باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرا سریہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیر کمان ذی قعدہ میں بھیجا جو تیس مہاجر صحابہؓ پر مشتمل تھا۔ آپ نے دیکھا کہ مسلسل ہر ماہ حضور ایک ایک مہم روانہ فرما رہے ہیں۔ اس سریہ کے لئے حضورؐ نے قرار کا مقام متعین فرمایا تھا۔ میں تا حال معین (Locate) نہیں کر سکا کہ اس وقت وہ مقام کس جگہ پر ہے۔ بہرحال تاریخ میں آتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمادیا تھا کہ وہاں تک جاؤ، اس سے تجاوز نہ کرنا۔ میں پھر عرض کر دوں کہ ان مہموں کا مقصد دراصل قریش کے تجارتی راستوں پر اصل میں اپنی موجودگی ثابت کرنا تھا اور قریش کو ان راستوں کے مخدوش ہونے کی تشویش میں مبتلا کرنا تھا حضورؐ کے یہ اقدامات ان کی معیشت کے اعتبار سے نہایت نازک اور پریشان کن (Critical and cruical) تھے۔ چونکہ ان کے شام کے لئے تجارتی قافلے ان راستوں سے گزرتے تھے۔

اس کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے ـــ اس سلسلے کا پہلا سفر ۲ سنہ ھ میں ہوا۔ بنو ضمرہ کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا وہاں حضورؐ نے قیام فرمایا۔ اس سفر کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اپنی موجودگی (Presence) کا اظہار ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ اس قبیلہ کے ساتھ حلیف ہونے کا معاہدہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طے پا گیا۔ دوسرا سفر ربیع الاوّل یا ربیع الآخر میں ہوا۔ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ اس میں غزوۂ بواط واقع ہوا ہے۔ اس میں حضور خود شریک تھے۔ مقام کا نام اور مہینہ تو سیرت کی کتابوں میں موجود ہے لیکن اس کی تفاصیل سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت اہم سفر کا ذکر کتب سیر میں غزوۂ عشیرہ کے عنوان سے ملتا ہے۔ حضورؐ کا یہ سفر قریباً دو ماہ پر محیط تھا۔ یعنی جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ ۲ سنہ ھ

ـــــ اور حضورؐ نے یہ سفر اختیار فرمایا تھا اس قافلے کو روکنے کے لئے جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کو جا رہا تھا۔ یہی وہ قافلہ ہے کہ جب واپس آ رہا تھا تو حضورؐ نے اس کو Intercept کرنے یعنی روکنے کا ارادہ فرمایا تو اس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر واقع ہو گیا ـــــ اس قافلہ کا بھی ایک مخصوص تاریخی پس منظر ہے، اسے بھی سمجھ لیجئے ـــــ آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ کی ہجرت سے متصلاً قبل اور بعد مکہ سے مہاجرینؓ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی لیکن اکثر و بیشتر مہاجرین اپنے اہل و عیال کو ساتھ نہیں لا سکے تھے۔ وہ مکہ ہی میں رہ گئے تھے اور اسی طرح ان کا ساز و سامان اور ان کا اثاثہ و سرمایہ بھی مکہ ہی میں رہ گیا تھا۔ لہٰذا دارالندوہ میں مشرکینِ مکہ نے یہ طے کیا تھا کہ تمام مہاجرین کی تمام چیزیں ضبط کر لی جائیں اور ان کی فروخت سے ایک بہت بڑا فنڈ قائم کیا جائے، اس سے ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تشکیل دیا جائے اور اس سے جو منافع ہوگا اس کو مسلمانوں پر لشکر کشی کے لئے استعمال کریں گے۔ تو گویا یہ محض ایک تجارتی قافلہ نہیں تھا بلکہ آئندہ جو مسلح تصادم ہونے والا تھا اس کے لئے مالی ذرائع فراہم کرنا بھی اول روز سے اس قافلہ کی ترتیب میں پیشِ نظر تھا ـــــ یہ خبر مدینہ پہنچ چکی تھی اور بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست بھی کی تھی کہ اب ہمیں جنگ کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ ہم جو ساز و سامان اور جو اثاثہ بیت مکہ میں چھوڑ کر آئے تھے وہ سارا کا سارا انہوں نے ضبط کر لیا ہے اور اس کے منافع سے جنگی تیاری قریش کے پیشِ نظر ہے۔

بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قافلے کے تعاقب کے لئے نکلے اور یہاں نوٹ کیجئے کہ حضورؐ کے ساتھ ڈیڑھ سو مہاجرین اور تیس اونٹ تھے۔ میں اسے خاص طور سے کیوں بیان کر رہا ہوں! اس لئے کہ غزوۂ بدر میں تین سو تیرہ اصحابِ رسولؐ تھے اور ستر اونٹ تھے معلوم ہوا کہ غزوۂ بدر میں جتنی طاقت موجود تھی غزوۂ عشیرہ میں اس سے لگ بھگ نصف تعداد شریک تھی۔ حضورؐ نے قافلہ کے تعاقب میں ینبوع تک پہنچ گئے۔ لیکن چند دنوں کا فصل پڑ گیا تھا اور قافلہ چند راتیں قبل شام کی طرف نکل چکا تھا۔ لہٰذا اس کا راستہ روکا نہیں جا سکا۔ البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں قیام فرمایا اور وہاں جو قبیلہ آباد تھا یعنی قبیلۂ بنی مطلق، اس کے ساتھ مصالحت کی۔ طے یہ ہوا کہ قبیلہ بنی مطلق کے لوگ غیر جانبدار رہیں گے۔ نہ تو قریشِ مکہ کے خلاف مسلمانوں کی مدد کریں گے نہ مسلمانوں کے خلاف قریشِ مکہ کی۔ یہ غزوہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کا بالواسطہ تعلق غزوۂ بدر سے جڑ جاتا ہے۔ اس کی نوبت کیوں آئی! میں اسے آگے بیان کروں گا۔

غزوۂ بدر سے متصلاً قبل ایک غزوہ اور ہے جسے غزوۂ بدرِ اُولیٰ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ

کہ ایک شخص عرض ابن شعری نے مسلمانوں پر اپنی ذاتی حیثیت سے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور مدینہ کے قرب و جوار میں لوٹ مار کی اور چند مویشی پکڑ کر لے گیا۔ اس میں قریش کا ہاتھ نہیں تھا۔ حضورؐ نے تعاقب کیا بدر تک آپؐ پہنچے لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ اس سے آگے حضورؐ تشریف نہیں لے گئے اور مراجعت فرمائی۔ چونکہ یہ بھی حضورؐ کا ایک سفر ہے، طاقت کے ساتھ، نفری کے ساتھ۔ لہٰذا یہ بھی ان غزوات کی فہرست میں شامل ہے۔

غزوۂ بدر کا ایک اہم سبب

اب میں اس سلسلہ کا اہم ترین واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ جس نے اصل میں مکہ میں آگ لگائی۔ یہ واقعہ سریہ عبداللہ ابن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے سیرت کی کتب میں مذکور ہے۔ اس کا خاص معاملہ یہ ہے کہ حضورؐ نے حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کو ایک خط دیا۔ خط بند تھا۔ اور یہ فرمادیا کہ مکہ کی طرف جاؤ اور جب مدینہ سے دو دن کی مسافت طے کرلو تب یہ خط کھولنا پھر اس میں دیکھنا کہ کیا لکھا ہے! اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا ــــ اب آپ اندازہ کیجئے کہ رازداری (Secrecy) کس درجہ کی ہے! حضورؐ نے اس درجہ اس کو مخفی رکھا ہے کہ خود کمانڈر کو معلوم نہیں ہے کہ وہ مہم کیا ہے جو میرے سپرد کی گئی ہے! بعض روایات میں بارہ صحابہ اور بعض میں آٹھ کی تعداد کا ذکر آتا ہے جو حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کے ساتھ تھے۔ مدینہ سے دو دن کی مسافت کے بعد انہوں نے خط کھولا تو اس میں ہدایت تھی کہ "وادیٔ نخلہ پہنچو، یہ وادیٔ نخلہ کہاں ہے! اب ذرا جغرافیہ کو ذہن میں لائیے۔ مکہ جنوب میں ہے مدینہ شمال میں اور طائف مکہ سے جنوب مشرق میں ہے۔ مدینہ سے وہاں کا فاصلہ کم از کم تین سو میل کا ہے۔ یہاں مہم بھیجنا بغیر کسی اہم منصوبہ کے اور بغیر کسی سوچے سمجھے اقدام کے ممکن نہیں تھا، یہ تمام کارروائی بلاسبب نہیں تھی۔ تو حضرت ابن جحشؓ کو حکم ہوا کہ "مکہ اور طائف کے درمیان جاکر وادیٔ نخلہ میں قیام کرو اور قریش کی جو نقل و حرکت ہے اس کو اچھی طرح Watch کرو۔ یعنی اس پر کڑی نظر رکھو۔" میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یمن کی طرف قریش کے قافلے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یمن کا راستہ طائف سے ہو کر گزرتا ہے اور وادیٔ نخلہ طائف اور مکہ کے درمیان واقع ہے ــــ جو قافلے شام کو جاتے تھے ان کے راستوں کے متعلق میں نے اس سے قبل سات مہمیں آپ کو گنوادی ہیں جو ان راستوں میں اپنی موجودگی (Presence) ثابت کرنے اور ان کو مخدوش بنانے کے لئے گئی تھیں۔ لیکن یہ مہم اس راستہ کے لئے تھی جو طائف ہو کر یمن جاتا

تھا۔ تو حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کو ہدایت کی گئی کہ "وادیٔ نخلہ میں جاکر قیام کرو اور قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور ہمیں ان کے بارے میں اطلاعات دیتے رہو"۔ حضرت عبداللہ ابن جحشؓ نے جب خط پڑھا تو چونکہ مہم بڑی سخت اور کڑی آپڑی تھی۔ لہٰذا آپؓ نے اپنے ساتھیوں کو آزاد کر دیا کہ میں تو جاؤں گا اس لئے کہ حضورؐ کا حکم ہے لیکن تم سے جو میرا ساتھ دینا چاہے دے میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ ان سب نے کہا جو حضورؐ کا حکم ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر ــــ ان سب نے جاکر وادی نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں ایک قافلہ آگیا۔ مختصر سا قافلہ تھا۔ قریش کے کل پانچ افراد اس قافلہ میں شامل تھے۔ اگرچہ تھے سبھی بڑے اونچے گھرانے کے لوگ متعدد اونٹوں پر لدا ہوا کافی سامان تجارت ان کے ساتھ تھا جو وہ طائف سے مکہ لے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ جب وہاں سے گزرا تو مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہم کیا کریں۔ اگرچہ حضورؐ کے خط میں صراحت نہیں تھی کہ حملہ کیا جائے۔ لیکن ان کی رائے یہ ہوئی کہ ہمیں حملہ کرنا چاہیئے ــــ یہاں ایک بات میں آپ سے عرض کر دوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صورت حال ایسی ہو جائے کہ آنکھ مڈبھیڑ ہو جائے تو جنگ کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہوتا ــــ اور اندازہ ہوتا ہے کہ صورتحال (Situation) کچھ ایسی ہوئی ہے کہ مقابلہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ والوں میں سے ایک شخص جس کا نام عمرو ابن عبداللہ الحضرمی، بیان کیا گیا ہے، وہاں قتل ہو گیا ــــ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ اگرچہ حضرموت کا رہنے والا تھا لیکن مکہ میں امیہ ابن حرب (ابوسفیان کے والد) کا حلیف تھا اور وہاں حلیف کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس تجارتی قافلے میں مغیرہ کے دو بیٹے اور ایک آزاد کردہ غلام شامل تھے۔ مغیرہ کے خاندان کا شمار قریش کے چوٹی کے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ بہرکیف مقابلہ کے نتیجہ میں عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ دو افراد جان بچا کر فرار ہو گئے۔ اور بقایا دو کو انہوں نے قیدی بنا لیا۔ ان دو قیدیوں اور مال غنیمت، جو بھی ہاتھ لگا، کو لے کر یہ حضرات مدینہ واپس آگئے۔

اس واقعہ کے متعلق ہمیں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت[1] کے مطابق حضورؐ نے حضرت عبداللہ بن جحش پر کوئی عتاب نہیں فرمایا۔ آپؐ نے مال غنیمت میں سے خمس بھی قبول فرما لیا جو دو قیدی تھے، ان کا فدیہ قبول کر کے انہیں آزاد فرما دیا۔ ان میں سے ایک قیدی حکم ابن کیسان

---

[1] اس روایت کو محمد ابن عبدالوہابؒ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ (مرتب)

وہیں مسلمان ہوگئے ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ! مغیرہ کے پوتوں میں سے ایک بھاگ گیا تھا۔ دوسرا قید ہوا جو فدیہ دے کر چلا گیا۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہ ابن جحش اور ان کے ساتھیوں پر نہ عتاب فرمایا نہ کوئی سرزنش فرمائی اور نہ ہی کوئی Explanation call کیا کہ تم نے میرے حکم سے تجاوز کیوں کیا ! یہ ایک رائے ہے ـــــ دوسری رائے جو بہت سی کتابوں میں بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ ناراضگی فرمایا۔ مالِ غنیمت قبول نہیں فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں حملہ کی اجازت نہیں دی تھی۔ میری ہدایت صرف یہ تھی کہ وہاں قیام کرو۔ قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور اس کی ہمیں اطلاع دیتے رہو۔ لہٰذا یہ اقدام تم نے خود کیا ہے ـــ اس میں ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا تھا، وہ بھی عرض کر دوں ۔ وہ ماہِ رجب کی آخری تاریخ تھی ۔ رجب کا مہینہ اشہرِ حُرم میں شامل ہے ۔ یعنی ان چار مہینوں میں سے ایک ہے جن میں مشرک و کافر بھی جنگ نہیں کرتے تھے ـــ محمد ابن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے یعنی مہم کے ارکان نے مشورہ کیا کہ ہمارے سامنے دو متبادل صورتیں ہیں ۔ اگر ہم ان کو چھوڑ دیتے ہیں تو رجب کی حُرمت تو بچ جائے گی لیکن پھر یہ حدودِ حرم میں داخل ہو جائیں گے ۔ وہاں ان پر حملہ ممکن نہ ہوگا ۔ ہم دو حُرمتوں کے مابین آگئے ہیں ۔ رجب کی آخری تاریخ تھی ۔ رات شروع ہوئی تو رجب بھی ختم اور اشہرِ حُرم بھی ختم ـــ بہرحال ان کا مشورہ یہ ہوا کہ جنگ کی جائے اور جنگ کا نتیجہ وہ نکلا جو میں بیان کر چکا ہوں ۔

اس پوری صورت حال پر غور کرنے کے بعد میں جو نتیجہ اخذ کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ ناراضگی فرمایا تب بھی یہ بات مسلّم ہے کہ سزا کوئی نہیں دی ۔ یہ یقینی بات ہے ۔ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ صورتِ حال (Situation) ایسی بن گئی تھی کہ اس میں اگر صحابہ کرامؓ اپنے ہاتھ باندھے رکھتے تو ہو سکتا تھا کہ سب شہید ہو جاتے ـــــ مڈبھیڑ ہوئی ہے، آمنا سامنا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے ۔ واللہ اعلم ۔ واقعہ کی تفاصیل تو مجھے نہیں مل سکیں ۔ اللہ کرے کہ کچھ باحوصلہ حضرات مکہ کس لیں اور سیرت کی جو اور بہت سی مستند کتب متقدمین کی موجود ہیں ان کا تحقیقی مطالعہ کریں اور اس واقعہ کی تفاصیل کو جمع کریں ۔ چونکہ یہ بہت اہم واقعہ ہے ۔

اس کا نتیجہ کیا نکلا ! اب اسے پہچان لیجئے ۔ مکہ میں جب یہ خبر پہنچی ہے تو وہاں آگ لگ گئی ۔ اس لئے کہ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد پہلا علَم (جھنڈا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند فرمایا ۔ پہلا تیر چلا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے ۔

پہلا قتل ہو گیا اصحابؓ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے۔ حضورؐ نے حکم دیا تھا یا نہیں دیا تھا بہرحال بالفعل یہ کام ہوا حضورؐ کے آدمیوں کے ہاتھوں! ظاہر بات ہے کہ اس کی ذمہ داری تو یقیناً آئے گی۔ جماعتی سطح پر تو یہی ہوتا کہ اس جماعت کا کوئی فرد جب کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری جماعت کے قائد پر آتی ہے۔ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ حضورؐ اس سے بالکلیہ برأت کا اظہار فرماتے۔ یا اقدام کرنے والوں کو سزا دیتے اور مشرکین کے نقصان کی تلافی فرماتے۔ ایسی کوئی شکل حضورؐ نے اختیار نہیں فرمائی۔ گویا آپؐ نے اپنے اصحابؓ کے اس اقدام کو قبول (Own) فرما لیا ــــ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکّہ میں چیخ پکار شروع ہو گئی کہ قتل کا بدلہ قتل، خون کا بدلہ خون! ــــ مکّہ میں یہ جو آگ لگی ہوئی تھی آپ اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ کسی قبائلی معاشرے میں یہ معاملہ کس قدر جذباتی اور اہم ہوتا ہے۔

ایک طرف مکّہ میں ہیجان خیز صورت حال تھی، دوسری طرف ابوسفیان کے قافلہ کی واپسی کا وقت آگیا۔ وہی قافلہ جسے عشیرہ والے غزوہ کے موقع پر حضورؐ نے روکنے (Intercept) کی کوشش فرمائی تھی۔ تو ابوسفیان کی طرف سے مکّہ میں یہ ہنگامی پیغام (S.O.S Call) پہنچ گیا کہ مجھے خطرہ ہے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے ساتھیوں سے کہ وہ ہمارے قافلہ کو لوٹ لیں گے اور قافلہ میں مال بہت ہے۔ بہت بڑا قافلہ تھا ــــ لہٰذا مجھے فوراً کمک پہنچائی جائے اور قافلہ کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے ــــ یہ دونوں باتیں تھیں کہ جن کی بنا پر مکّہ میں جو جنگجو، جوشیلے اور مشتعل مزاج لوگ (Hawks) تھے وہ قابو سے باہر ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک دلیل آگئی تھی اسی طرح کے نمایاں اشخاص تھے ابوجہل اور ابوسفیان ــــ

اس کے ساتھ ساتھ مکّہ میں ٹھنڈے مزاج، بردبار طبیعت کے حامل اور شریف النفس لوگ (یعنی Doves) بھی موجود تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ خانہ جنگی ہو۔ ان میں نمایاں شخصیتیں تھیں عتبہ ابن ربیعہ اور حکیم ابن حزام کی۔ آخر الذکر تو بعد میں ایمان لے آئے۔ جلیل القدر صحابی ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کی پھوپھی تھیں تو اس رشتہ سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ان کے بھتیجے ہوئے۔ عتبہ ابن ربیعہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس نے ہجرت کے بعد قریش سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب تم محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے خلاف کوئی اقدام مت کرو۔ اب انہیں عرب کے حوالے کر دو۔ اب محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا عرب سے ٹکراؤ ہوگا۔ ہم تو اب تماشا دیکھیں گے۔ اگر محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جیت جاتے ہیں اور پورے عرب پر ان کا قبضہ و تسلط ہو جاتا ہے تو ہماری ہی جیت ہے۔ آخر وہ قریشی ہیں۔ وہ

ہمارے ہی آدمی ہیں، بڑا دُور اندیش، سیاست دان اور مدبر آدمی تھا ـــــ اس نے مزید کہا کہ " اگر عرب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہلاک کر دیں تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تمہیں اپنے بھائی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگنا نہیں پڑے گا"۔ اس قدر دُور اندیشی کا مشورہ تھا جو عُتبہ نے دیا تھا۔ تو عتبہ اور حکیم ابن حزام آپس کی خونریزی سے بچنا چاہتے تھے۔ دوسری جانب ابوجہل (Hawks) کا چیف تھا وہ چاہتا تھا کہ فوری اقدام کیا جائے ـــ اب جب یہ صورت حال پیش آ گئی تو یوں سمجھئے کہ ان کے جوشیلے اور جنگ پسند لوگوں (Hawks) کو تقویت حاصل ہو گئی کہ ایک تو ہمارا آدمی عمرو بن عبداللہ الحضرمی وادی نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لہٰذا خون کا بدلہ خون سے ہوگا اور دوسری طرف ہمارے تجارتی قافلہ کو شدید خطرہ درپیش ہے۔ لہٰذا ان بہانوں سے ایک ہزار جنگجوؤں کا کیل کانٹے سے لیس لشکر تیار ہوا۔ یہ دو دلیلیں جنگ پسند عناصر (Hawks) کے ہاتھوں ایسی آ گئی تھیں کہ جو امن پسند اور صلح جو (Doves) تھے وہ مجبور ہو گئے۔ ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ اس آگ کو فرو کر سکیں۔ چنانچہ ایک ہزار کا لشکر مکہ سے مدینہ روانہ ہوا۔ جس کے نتیجہ میں غزوہ بدر ہوا۔ چونکہ یہ غزوۂ القتال محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا نقطۂ آغاز ہے۔

میرا یہ خیال تھا کہ میں آج مسلح تصادم کے متعلق اپنی گفتگو مکمل کر لوں گا۔ لیکن بات مکمل نہیں ہو پا رہی۔ وقت معمول سے زیادہ گزر گیا ہے۔ لہٰذا بقیہ حصہ پر کسی قدر تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ اگلے جمعہ ہو گی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات !!!!

(جاری ہے)

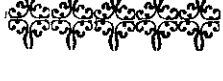

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کیلئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا ان صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حُرمتی سے محفوظ رکھیں ـــــ!

Freshwel
حلوہ جوزی
مہمان نوازی کے رنگ
فریش ویل سوئیٹس
کے سنگ
فریش ویل سوئیٹس
اورحلوہ جات نہ صرف بیرون
ملک بلکہ اندرون ملک بھی
معزز مہمانوں کی تواضع، عزیز واقارب
اور دوست احباب کو سوغات کے
طور پر دینے کے لیے خوش ذوق حضرات کا
بہترین انتخاب ہے
احمد کے حلوہ جات پاکستان میں پہلی بار
جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر سیلوفین پیکنگ
کے ساتھ ایئرٹائٹ ڈبوں میں پیش کئے جاتے
ہیں جس کا ڈھکن آسانی سے کھل جاتا ہے۔
مٹھائیوں میں رونق اور صنعتی معیار کے خالق
احمد
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی-۱۱۲، سائٹ-کراچی - فون: ۹۵ - ۲۹۴۲۹۱
MASS

(دوسری قسط)

دلِ افگندیم

بسم اللہ مجرھا و مُرسٰھا

از قلم

مولانا سعید الرحمٰن علوی

حضور نبی مکرم، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین والمعصومین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے محبوب صحابی، عزیز اور کاتبِ وحی سیدنا امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک روایت ہے جسے صاحبِ مشکوٰۃ نے "باب ثواب ہذہ الامۃ" میں نقل کیا امام بخاری قدس سرہٗ سے اس کے جو الفاظ منقول ہیں وہ یہ ہیں:

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی ولن تزال ھذہ الامۃ قائمۃ علی امر اللہ لایضرھم من خالفھم حتی یاتی امر اللہ۔

(بخاری ص۱۶، ج ۱۔ اصح المطابع، کراچی / دارمی ص۲، ج ۱۔ مطبوعہ دمشق)

اسی سلسلہ کی مزید روایات

اس سے قبل کہ ہم اس حدیث پر گفتگو کریں اور بات کو آگے بڑھائیں امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے اجر و ثواب اور اس کے مقام و مرتبہ کے متعلق چند اشارات عرض کرنا ضروری خیال کرتے ہیں:

قرآنِ عزیز نے اس امت کو "خیر امۃ" کہا جس کا مفہوم بالکل واضح ہے اور اس کا سبب اس کا وہ اجتماعی فعل و عمل ہے جس کا اسی آیت (آل عمران ۔ ۱۱۰) میں متصل ذکر ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ دوسری طرف قرآنِ عزیز ہی نے اس امت کو امتِ وسط (البقرہ ۔ ۱۴۳) جس کا مفہوم ہے اعتدال۔ اور اسی آیت میں اس کی اس حیثیت کا ذکر ہے کہ وہ "شہادت علی الناس" کے منصب پر فائز ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے شیخ الصحابۃ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں اس بات کا حضور علیہ السلام نے ذکر فرمایا کہ تمہارا اور باقی امتوں کے

اوقات کی تقسیم کا معاملہ اس طرح کا ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں تمہارا وقت اتنا ہے جتنا دن میں عصر و مغرب کے درمیان کا مختصر وقت۔ تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی شخص کسی سے محنت مزدوری کراتا ہے اور نصف دن کی مزدوری ایک قیراط (ایک سکہ) ادا کرتا ہے پھر دوپہر سے عصر تک دوسرے سے اسی مزدوری پر کام کراتا ہے اور تیسرے سے عصر سے مغرب تک کام کراتا ہے لیکن مزدوری ۲ قیراط دیتا ہے۔ پہلا مزدور یہودی ہے دوسرا عیسائی اور تیسرا مسلمان۔ اس پر اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نے ناراضی کا اظہار بھی کیا یا بقول بعض قیامت میں کریں گے کہ ہمارا وقت زیادہ اور مزدوری کم ہے لیکن حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رب العزت نے ان سے فرمایا:

ھل ظلمتکم من حقکم شیئا؟	تمہارے طے شدہ حق سے میں نے کچھ
قالوا لا۔	رکھ لیا ہے؟ جو تمہیں نہیں دیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ایسا تو نہیں۔

(بحوالہ زجاجۃ المصابیح ص۲۹۸، ج ۵۔ حیدرآباد دکن)

امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (یکے از محدثین صحابہ) کی روایت نقل کی جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"میری امت میں میرے ساتھ سب سے زیادہ محبت تو ان لوگوں کو ہے جو میرے بعد ہوں گے لیکن میرے دیکھنے کی تمنا اور خواہش میں مبتلا ہوں گے۔" (زجاجہ ص۲۹۹)

حضور نبی کریم علیہ السلام نے صحابہ کرام سے پوچھا:

ای الخلق اعجب الیکم ایمانا	کونسی مخلوق ایمان کے اعتبار سے تمہارے لئے باعث تعجب ہے؟

صحابہ نے "ملائکہ" کا عرض کیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"کہ یہ کونسا تعجب کا معاملہ ہے؟ ملائکہ کا ہے کو ایمان نہ لاتے، وہ اپنے رب کے پاس رہتے ہیں۔"

اب صحابہ نے انبیاء علیہم السلام کا کہا تو آپ نے فرمایا: "یہ بھی کوئی بات نہیں۔ وہ تو ایسی جماعت ہے کہ:

والوحی ینزل علیھم	ان پر وحی نازل ہوتی ہے

ظاہر ہے کہ اب مسئلہ خود صحابہ کا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے متعلق عرض کیا تو پیغمبر اسلام علیہ السلام نے فرمایا:

"ومالکم لا تومنون وانا بین اظہرکم
تم کیوں کر ایمان نہ لاتے حال یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں "۔
پھر آپ نے از خود ہی اس عقدہ کو حل کیا اور فرمایا:
"ان اعجب الخلق الی ایمانا القوم یکونون من بعدی یجدون
صحفا فیہا کتاب یومنون بما فیہا" (البیہقی / زجاجہ ۳۹۹)
گویا آپ نے انہیں قابل مبارکباد و باعثِ تعجب بتلایا جو بعد میں آئیں گے اور "کتاب مبین" کو دیکھ کر اور اس میں موجود تقاضوں کو جان کر اس پر ایمان لائیں گے۔
ایک روایت مسند احمد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی گئی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"طوبی لمن رانی وطوبی سبع مرات لمن لم یرنی و آمن بی" (زجاجہ ۴۰۰)
میرے دیکھنے والوں کے لئے ایک بار مبارکباد لیکن نہ دیکھنے کے باوجود ایمان لانے والوں کے لئے سات بار مبارک باد۔

عشرہ مبشرہ کے صحابی "امینِ امت حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا۔
"ہم سے کوئی اچھا ہے۔ ہم نے اسلام قبول کیا اور آپ کی رفاقت میں جہاد کیا"
اس کا جواب ملا:

نعم یکونون من بعدکم یومنون بی ولم یرونی (احمد / دارمی / زجاجہ: ۴۰۰)
حضرت عبد الرحمٰن بن العلاء الحضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ .... حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"میری امت کے آخری دور میں ایک ایسی قوم ہو گی جس کو پہلوں کی مانند اجر ملے گا۔
(اس کا سبب یہ ہو گا کہ) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوں گے اور اہلِ فتن سے
قتال کریں گے"۔ (بیہقی / زجاجہ ۴۰۱)
(اہلِ فتن سے مراد صاحب مرقاۃ رحمہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک خوارج، روافض اور
سبھی اہلِ بدعت ہیں۔ نیز اہلِ بغاوت بھی)

امام ترمذی قدس سرہٗ خادم رسول حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ارشادِ رسول ﷺ نقل کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا کہ:

"میری امت کی مثال بارش کی سی ہے، نہیں معلوم کہ اس کے پہلے حصہ سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے یا آخری حصہ سے!　　(زجاجہ/۱۰۱م، ج ۵)

یہ ارشادات جہاں امت کی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں۔ وہاں بین السطور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ہر دور و ہر قرن میں خیر و بھلائی کی جدوجہد جاری رہے گی۔ اس لئے کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں (صحابہ کرام) کی مطلق فضیلت تو ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ اس کے متعلق سرے سے دو رائیں نہیں ہوسکتیں پھر "ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" کے ارشادِ نبوّت کے مطابق متصل حضرات کی فضیلت و برتری بھی طے ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ہے کہ کبھی بارش کا ابتدائی دور زیادہ نافع ہوتا ہے کبھی آخری دور۔ بارش ہونے کے اعتبار سے ہر دور برابر ہے۔ نفع کی بات کہ کس دور سے زیادہ نفع ہوگا، الگ معاملہ ہے۔ بہر حال خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ہر دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دینی جدوجہد ان روایاتِ مبارکہ سے ثابت ہوتی ہے اور اسی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

ابتدا میں سیدنا معاویہ بن ابی سفیان اموی رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے جو روایت نقل کی گئی۔ اس میں ارشاد ہے:

اللہ تعالیٰ جس کسی کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں، اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں (مزید ارشاد ہوا کہ) میں قاسم (تقسیم کنندہ) ہوں فی الحقیقت عطا فرمانے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور ہمیشہ یہ امت امرِ الٰہی پر قائم رہے گی، اس کے مخالفین اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ جب تک "اللہ تعالیٰ کا امر" نہ آجائے۔

روایتِ معاویہؓ میں الفاظ کی کمی بیشی اور اس کا مفہوم

بعض دوسری روایات میں کچھ الفاظ کی کمی بیشی ہے۔ مثلاً جو روایت اور اس کا مفہوم نقل ہوا اس میں پوری امت کا ذکر ہے تو ایک دوسری روایت میں الفاظ اس طرح ہیں:

یقول لایزال من امتی امۃ ـــــ گویا پوری امت میں سے ایک طبقہ کا ذکر ہے۔ پھر "قائمۃ علی امر اللہ" کے بجائے یہاں دوسری روایت میں "قائمۃ بامر اللہ" ہے۔ (ای بامر دینہ واحکام شریعتہ من حفظ الکتاب وعلم السنۃ والاستنباط منھما والجھاد فی سبیلہ والنصیحۃ لخلقہ وسائر فروض الکفایۃ) لایضرھم کے بعد "من خذلھم ولا من خالفھم" ہے اور "حتی یاتی امر اللہ" کے بعد یہ جملہ ہے" وھم

علی ذٰلک"۔ محدثین کے بقول یہ جملہ "کہ مخالفین اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے" اس کا مطلب یہ ہے کہ:

جو لوگ اس جماعت کی مدد و نصرت ترک کر دیں گے وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ وہ اپنا نقصان کریں گے اور اپنے طور پر گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لادیں گے۔

"حتی یاتی امر اللہ" سے مراد "موت" ہے کہ جب موت آجائے گی، انفرادی یا اجتماعی تب تک یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ ایک روایت میں وہ امت اور طبقہ جو "قائمۃ بامر اللہ" ہوگا اس کے لئے "منصورین" کا لفظ ہے جو بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے افراد اور جماعتوں کی مدد من جانب اللہ اس طرح ہوگی جس کا نقشہ قرآن نے "من حیث لا یحتسب" کے الفاظ سے کھینچا یعنی "بے وہم و گماں" اور محدثین نے "منصورین" کا ترجمہ کیا "غالبین علی اعداء الدین" اصحاب حدیث و ارباب معرفت اس حدیث پہ گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"فیہ اشارۃ الی ان وجہ الارض .... الخ (زجاجہ ۲۰۰، ۵)

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین صلحاؑ سے کبھی خالی نہ ہوگی، ان صلحاء کی شان و کمال یہ ہوگا کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کے اوامر پہ ثابت قدم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے نواہی سے دور ہوں گے، امورِ شریعت کی حفاظت کرنے والے ہوں گے۔ لوگ ان کی معاونت کریں یا مخالفت، اس کی انہیں پرواہ نہ ہوگی، ان کے لئے ہر معاملہ یکساں ہوگا۔"

گویا وہ برابر اپنا کام کرتے جائیں گے اور کسی بات کی پرواہ نہ کریں گے، انہوں نے اپنی کشتیاں جلا ڈالی ہوں گی اور کسی کی مخالفت و معاونت پہ نہیں بلکہ اللہ رب العزت کی مدد و نصرت پہ ان کی نظر ہوگی ____ بقول شاعر ؎

ہم کو طوفانِ حوادث کیا ڈرائے گا حمید جب سے ہم پیدا ہوئے یہ آندھیاں دیکھا کئے

اور صاحبِ مرقاۃ قدس سرہٗ نے (ج ۱۱) یہ مطلب بھی لکھا:

ان شوکۃ اھل اسلام لا تزول بالکلیۃ

کہ اہلِ اسلام کی شوکت بالکلیہ زائل نہ ہوگی۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہ روایت قریب قریب انہی الفاظ میں امام دارمی قدس سرہٗ نے اپنی مسند صـ۲۹۷، ج ۲ پہ نقل کی اور مختلف حوالوں سے امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح صـ۱۴۳ ج ۲ پہ اسے نقل و درج کیا۔

اس روایت میں چونکہ "تفقہ فی الدین" کا ذکر ہے اس لئے حافظ ابنِ حجر عسقلانی

رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں :

" اس روایت میں سبھی لوگوں پر علماء اور سبھی علوم پر فقہ کی فضیلت کا واضح اور ظاہر بیان ہے " (فتح الباری ۔ ص۱۳۴، ج ۱)

طائفہ منصورہ کی تشریح

محدثین اور شراح حدیث نے اس " طائفہ منصورہ " کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بظاہر مختلف آراء کا اظہار کیا لیکن فی الحقیقت مآل سب کا ایک ہے ۔ مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

ھم اھل العلم (بخاری ص۱۰۸۷، ج ۲، اصح المطابع، کراچی)

اور امام کا ایک قول ان کے شارح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا : ھم اھل العلم بالآثار (فتح الباری ص۱۳۴ ج ۱) امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ "اصحاب الحدیث" کہتے ہیں ۔ (ترمذی ص۴۲ ج ۲) اسی طرح امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح مسلم میں (ص۱۴۳، ج ۲)، شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ غنیۃ الطالبین ص۱۹۸ مطبوعہ مصر میں اور خطیب بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ مجاہد، محدث، مفسر اور حنفی امام عبداللہ ابن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے (ص۲۶) یہی ارشاد فرماتے ہیں :

اور دورِ حاضر کے مشہور عالم مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں :

" بعض جگہ اہل حدیث، بعض جگہ اصحاب حدیث، بعض جگہ اہل اثر، بعض جگہ محدثین مرجع ہر لقب کا یہی ہے ۔ (تاریخ اہل حدیث ص۱۲۸)

علامہ میر سیالکوٹی کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر کوئی خاص طبقہ کسی خاص سبب سے اپنے آپ کو اہل حدیث کہلائے تو وہ سر آنکھوں پر، لیکن طائفہ منصورہ کا معاملہ کسی خاص گروہ و جماعت میں محدود کرنا کسی طور درست نہیں کیونکہ ہر قرن اور ہر دور میں ایسے رجال کار اور جماعتیں موجود رہیں جو اس حوالہ سے سرگرم عمل رہیں اور جن کا کردار بلاشبہ بہت بلند ہے ۔
محدثِ کبیر امام نووی قدس سرہ لکھتے ہیں :

احتمال یہ ہے کہ یہ طائفہ مسلمانوں کے مختلف طبقات میں بٹا ہوا ہے ۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالاتا ہو مثلاً مجاہد، محدث، زاہد، آمر بالمعروف وغیر ذالک ، اور اس طبقہ کا ایک جگہ ہونا بھی ضروری نہیں ۔ بلکہ جائز و ممکن ہے کہ یہ طبقہ اور گروہ دنیا میں بکھرا ہوا ہو " (ص۱۴۳، ج ۲)

نبوت کے بعد کا دور : اہل سنت اور شیعی موقف

یہاں تک جو گفتگو تھی وہ حدیث کے ایک طالب علم کے طور پر تھی، اب ہم کوشش کریں گے کہ تاریخی حوالہ سے ہم گفتگو کر کے اپنے قارئین کے سامنے وہ تصویر پیش کر سکیں، جس کے ذریعہ پورے حقائق ان پر منکشف ہو جائیں۔

اس گفتگو کو شروع کرنے سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہماری گفتگو اہلسنت والجماعت کے اس صحیح اور مبنی بر صداقت موقف کے گرد گھومتی ہوگی جس میں نبوت و معصومیت کا سلسلہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا اور آپ کے بعد کسی بھی حوالہ سے کسی فرد اور شخصیت کو وہ مقام حاصل نہیں کہ اسے حلال و حرام کے اختیارات حاصل ہوں یا یہ کہ ایسے منصب کا حامل ہو جس کے ساتھ وحی کا معاملہ ہو۔ اس قسم کا تصور شیعی ہے جو حضور ختمی مرتبت کے بعد ۱۲ حضرات کیلئے (ان میں سے ان کے بقول ۱۱ آچکے بارہویں آئیں گے) ایسے ہی اختیارات و مقام کے قائل ہیں جو انبیاء کا خاصہ ہے بلکہ وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ "امامت برتر از نبوت است"۔

شیعی موقف کی خرابیاں

اس تصور کی رو سے حضور علیہ السلام کے سانحہ ارتحال کے بعد ۲۵ سال تک کا عرصہ جو امت کی مجموعی روش کے اعتبار سے نہایت درجہ شاندار و تابناک ہے، محض خلار کا دور ہے کہ اس دور میں بقول ان کے غاصب (نقل کفر کفر نہ باشد) مسلط رہے اور خلافت کے حقیقی حقدار (امام اوّل) سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جان بچانے کی فکر میں مبتلا رہے ۲۵ برس کا خلائی دور ختم ہوا تو خلافت کے حقیقی وارث کو اس کا مقام ملا اور وہ بھی اس طرح کہ اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا تا آنکہ اس کی شہادت ہو گئی، اس کے بڑے صاحبزادے (امام ثانی) سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس منصب پر فائز ہوئے۔ لیکن چند ماہ بعد بطائف الحیل اس منصب سے الگ ہو گئے۔ پھر وہ دن اور یہ دن نو اماموں کا دور بیت گیا اور بات نہ بن سکی، اتنا ضرور ہوا کہ یہ امام خاموشی سے سر چھپائے اپنے شیعوں کو یہ تلقین کرتے رہے کہ بس خاموشی سے وقت گزارو اور بارہویں امام کا انتظار کرو جو تمہارے غلبہ کا نشان ہوگا۔ اب صدیاں بیت گئیں وہ امام ابھی نہیں آئے اور دیکھیں کب ان کا ظہور ہوتا ہے؟

اس تصور کو مان لینے کا مطلب سیدھا سادا یہ ہے کہ حضور نبی مکرم علیہ السلام دنیا سے کیا رخصت ہوئے ان کا سارا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔ اور اب تک اس کے سلجھنے کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو رہی، لیکن ظاہر ہے کہ ہم اس تصور کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں مان سکتے، ہمارے نزدیک اسلام اور اسلامی تاریخ کی یہ

تصویر خود حضور علیہ السلام کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے ــــ ہمارے نزدیک اسلامی تاریخ ایک جگمگاتی اور روشن تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں کئی مواقع پر زبردست آندھیاں چلیں لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ کے بقول:

اِنَّ شَوْکَۃَ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لَا تَزُوْلُ بِالْکُلِّیَّۃِ !

حدیثِ تجدید ساتھ ہی ذرا تائید کے طور پر اس حدیث کو ملاحظہ فرمالیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اِنَّ اللہَ عزوجل یَبْعَثُ لھٰذہِ الامّۃ علی رأس کل مائۃ سنۃٍ مَن یجدد لھا دینھا

(ابوداؤد عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بحوالہ مرقاۃ ص ۳۰۲ ج ۱ مطبوعہ ملتان)

اس روایت میں ہر صدی کے سرے پر (صدی کا ابتدائی سرا یا انتہائی سرا جبکہ علم اور سنّت کا معاملہ گھٹ جائے اور جہالت و بدعات کی گرم بازاری ہوجائے" مرقاۃ ص ۳۰۲ ج ۱) ایک مجدد کے مبعوث کئے جانے کا ذکر ہے جس کا کام بقول صاحبِ مرقاۃ یہ ہوگا۔

"سنّت کا معاملہ بدعت سے واضح کرے گا، علم کو کثرت سے پھیلائے گا، اہلِ علم کی عزت کا باعث ہوگا، بدعت کا قلع قمع کرے گا اور اہلِ بدعت کی کمر توڑ دے گا۔"

صاحبِ مرقاۃ نے صاحب جامع الاصول کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "ہر شخص نے اس حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے ہم ذوق و ہم مسلک علماء کی اس ضمن میں ایک فہرست تیار کردی، جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شافعی مسلک کے اکابر علماء کی ایک فہرست تیار کردی ــــ جو بہرطور دل لگنے والی بات نہیں۔

حدیثِ تجدید پر اصولی گفتگو دورِ حاضر کے معروف عالم مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے معروف رسالہ "الفرقان" کا تقسیم ملک سے قبل ایک عظیم الشان نمبر نکالا تھا۔ جس کی نسبت حضرت الامام مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی طرف تھی۔ اس نمبر میں حضرت مجدد سے متعلق بہت نہایت درجہ قابل قدر مضامین تھے جن میں سے مولانا عبدالشکور لکھنوی (امام اہلسنت) مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور خود مولانا نعمانی کے بہت قیمتی مضامین ہیں، اس میں ایک مضمون حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تھا جس میں اس حدیث پر تفصیلی بحث تھی ــــ اس وقت اس کے نقل اور دہرانے کی ضرورت نہیں، صاحبِ مرقاۃ نے جو اصولی گفتگو کی اس کا خلاصہ دیکھ لیں۔ بات بن جائے گی۔

والاظھر عندی واللہ تعالیٰ اعلم .... الخ

اس سے ان کی گفتگو کا آغاز ہوتا ہے، فرماتے ہیں: جو تجدید کا کام کرے گا وہ شخص واحد نہیں ہوگا بلکہ اس سے مراد ایک جماعت ہے جو تجدید کا فرض سرانجام دے گی، ایسی جماعت ہر ملک اور شہر میں ممکن ہے۔ ہر فن اور علم کے شعبہ میں ایسی جماعتیں ممکن ہیں، جو ان کے بس میں ہو تقریراً یا تحریراً۔ ان کی یہ کاوشیں علم کے بقا کا سبب ہوں گی۔ "امر الٰہی" (موت یا قیامت) تک یہ کاوشیں اس کا باعث ہوں گی کہ علم محفوظ رہے اور مٹنے کے خطرات اس پر طاری نہ ہوں ــــــ

صاحبِ مرقاۃ نے جو موقف اختیار کیا واقعہ یہ ہے کہ ہر دور کے ذمہ دار اہلِ علم و محدثین کا قریب قریب یہی موقف ہے کہ ایسا کام اللہ رب العزت ہر دور اور ہر ملک و علاقہ میں مختلف افراد، جماعتوں اور اداروں سے لیتے رہے ہیں، لے رہے ہیں، لیتے رہیں گے۔ پہلی روایات کے ساتھ یہ روایت بھی اس کی مؤید ہے کہ "خادمانِ دین" ہر دور میں موجود رہیں اور تاریخی حقائق بھی اسی کی شہادت دیتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے بعد کا دور جسے خلافتِ راشدہ کا دور کہا جاتا ہے، اس کی عمر عام حضرات کے نزدیک ۳۰ برس ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان غنی اور سیدنا علی کے بعد (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا چند ماہ کا دور بھی اس میں شامل ہے۔ اسی بنیاد پر انہی حضرات کو خلفاء راشدین کہا جاتا ہے۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ حکومت کے نوعیت !!

لیکن میں اس معاملہ میں بڑے احترام سے اختلاف کرتے ہوئے سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس فہرست میں شامل کرتا ہوں وجہ یہ ہے کہ وہ آخری صحابی ہیں جنہیں حکومت وسلطنت کا موقعہ ملا۔ صحابہ کی جماعت کو اللہ رب العزت نے "راشدون" (حجرات: ۷) کہا۔ وہ اہلسنت کے اجتماعی موقف کے مطابق "عدول" اور "معیارِ حق و صداقت" ہیں ــــــ دورِ حاضر کے محدثِ کبیر مولانا ظفر احمد عثمانی الحنفی التھانوی قدس سرہٗ نے مولانا مودودی کی کتاب "خلافت وملوکیت" کا ایک جواب لکھا تھا جو کوثر نیازی صاحب کے رسالہ "شہاب" میں بالاقساط نکلا۔ حضرت امیرِ شریعت السید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ البساری کے خلف الرشید سید عطاء المنعم صاحب بخاری نے مولانا المرحوم کی تحریری اجازت سے ایک جاندار مقدمہ کے ساتھ ان اقساط کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ عنوان تھا "برأۃ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ" اس جواب پر جماعتِ اسلامی کے حلقوں کی جوابی کارروائی ہوئی

مولانا عثمانی کی نگرانی میں ان کے صاحبزادے نے جواب لکھا جو سید عطاء المنعم صاحب نے "تذکرۂ یاراں" کے نام سے شائع کیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب جیسے محدث اور نقاد نے جس خوبصورتی سے یہ چیزیں لکھیں یا لکھوائیں، وہ ان کا اہلسنت پر احسان ہے اور ان کی زبردست تدریسی اور محدثانہ خدمات پر زبردست اور خوبصورت اضافہ۔ اس میں مولانا نے بعض احادیث صحیحہ نقل کی تھیں جن میں اسلام کی چکی تیس برس سے زائد چلنے کا بھی ارشاد ہے، انہی روایات سے مولانا المرحوم نے سیدنا معاویہ کے لئے بھی استدلال کیا کہ انہیں اس فہرست میں شامل کیا جائے اور یہ کہ وہ اسمیں شامل ہیں :- احقر نص قرآنی "راشدین" کے حوالہ سے پہلے سے ایک ذہن رکھتا تھا۔ مولانا عثمانی کے اس ارشاد سے اور تقویت ملی اور اطمینانِ قلب نصیب ہوا۔ جزاهم الله تعالیٰ ورحمهم الله تعالیٰ رحمة واسعة۔

بہر طور ان حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کا دورِ سعادت تو ایسا ہے کہ اس کے متعلق کسی لمبی چوڑی گفتگو کی ضرورت نہیں، محدثین اور علماءِ اہلسنت کے بقول کسی شخص کے "صحابی" مان لینے کا معنی ہی یہ ہے کہ وہ مجموعی خوبیوں کا حامل ہے اور یہ کہ اس میں ہر وہ خوبی اور کمال ہے جسے خوبی اور کمال سمجھا جا سکتا ہے ـــــ ان کے دور میں جس طرح اسلام کی گاڑی آگے بڑھی اور قافلہ اہلِ اسلام نے اقصائے عالم میں پہنچ کر دین اسلام کا پھریرا لہرایا وہ تاریخ کا تابناک باب ہے۔ ایسا باب جس کا دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں۔ اس دور میں نہ صرف زمین فتح ہوئی، ملک قبضے میں آئے، بلکہ سب سے بڑھ کر اسلام کے پیغامِ حیات، اسلام کی دعوت اور اس کے نظریۂ حیات کو ترقی ہوئی، اسلامی عقائد اور اسلامی اعمال کی روشنی چار سو پھیلی اور گلستانِ اسلام کی خوشبو سے ساری دنیا مہک اٹھی۔ جو لوگ اس چھتری تلے اس طرح آئے کہ انہوں نے اسے اپنا لیا تو وہ دارین کے حوالہ سے بامراد و کامیاب قرار پائے۔ لیکن جنہوں نے اسے بطور فکر نہ اپنایا وہ بھی اس کی برکات، اس کے عدل اور اس کے ہمدردانہ رویہ سے مستفید ہوئے۔ کیونکہ بیگانہ رہ کر بھی اس ماحول میں انہیں جان و مال اور تحفظ حاصل تھا۔"

اسمیں شک نہیں کہ درمیان کا کچھ حصہ بالخصوص خلافت مرتضوی کا دور اس انداز سے گذرا کہ اس میں افراتفری اور باہمی انتشار کی سی کیفیت رہی لیکن باہمی احترام کا معاملہ ایسا تھا کہ اس سرِ مو فرق نہ آیا۔ اسلامی قدروں اور اخلاقی روایات کو گزند نہ پہنچی۔ اور بنیادیں سلامت رہیں ـــــ!!

امیر یزید کا معاملہ اور اس سلسلہ کی بعض گذارشات ــــ!!

سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد" واقعۂ کربلا" ایک ایسا واقعہ ہے جو اب تک امت کے گلے کا ہار بنا ہوا ہے۔ جس گروہ اور طبقہ کے نزدیک " امامت" ہی سب کچھ ہے اس نے اس کے حوالہ سے جو ادھم مچایا یا مچا رہے ہیں، اس کا نہ گلا نہ شکوہ۔ لیکن ستم یہ ہے کہ برادرانِ اہلسنّت نے ایک "تاریخی واقعہ" کو دین اور عقیدہ کا حصہ بنا کر اغیار کے پروپیگنڈا کا اپنے آپ کو شکار کر لیا۔ اگر قاضی ابوبکر بن العربی، امام ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیز قدس سرہم جیسے حضرات کا ذکر آتا ہے تو بہت سے دانشور انہیں صحابہ کرام کا وکیل صفائی کہہ کر مسترد کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ گویا صحابہ کا وکیل صفائی ہونا جرم ہے۔ یزید کی جانشینی کا معاملہ ہے تو آپ دیکھیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے طیب و پاک " بیٹے کی جانشینی کا سوال ہوا، سوال کرنے والے صحابہ، سوال ہوا محدّث امت فاروق اعظم سے، حرام نہ تھا، حرام ہوتا تو کوئی سوال نہ کرتا، فاروق اعظم نے گریز کیا تو کسی دوسرے سبب، فرمایا کہ یہ نعمت ہے تو بنو عدی اپنا حصہ پا چکے، آزمائش ہے تو بھی اب دوسرے آگے بڑھیں ـــــ مزید فرمایا کہ کیا اس شخص کو نامزد کر دوں جسے طلاق دینی بھی نہیں آتی! سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ان کے صاحبزادے سیدنا حسن کا سوال ہوا، یہاں بھی سائل آج کے دین داروں سے زیادہ دین دار تھے۔ سیدنا مرتضیٰ نے جواب دیا کہ میں تم کو نہ اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے روکتا ہوں ــ یہ تمہاری صوابدید کا معاملہ ہے ـــ تو جب امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بعض صحابہ نے ملّی مصالح کے تحت اس کا تقاضہ کیا تو ظاہر ہے کہ حرام کام تو نہیں کیا؛ یزید کے شخصی کردار کا معاملہ کیا تھا ـــ واللہ تعالیٰ اعلم ـ کسی کو علم نہیں، کہانیاں ہیں اور روایات۔ جب پہلے سے ایک بات طے کر لی گئی کہ بنو امیّہ بُرے ہیں۔ (معاذ اللہ) تو اب ان کے ایک فرد کو کوئی اچھا کاہے کو کہے؛ لطیفہ سمجھیں یا کچھ ـــ ہم علوی سیدنا علی مرتضیٰ سے نسبت و تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے باوا محمد ابن حنفیہ رحمہ اللہ تعالیٰ انہی کے فرزند تھے ـــ ان کی شہادت یزید کے حق میں تاریخ میں بہت اچھی ہے اور شہادت مشاہدہ کی بنیاد پر ہے ـــ پھر اس کو ذہن میں رکھیں کہ کربلا کے افسانوی انداز سے ہٹ کر واقعاتی حیثیت سے سیدنا حضرت حسین سلام اللہ تعالیٰ علیہ ورضوانہ کی "تین شرائط" ایسی ہیں (اور وہ شرائط خود شیعہ کی کتب میں موجود ہیں) جس سے معاملہ صاف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر مسئلہ وہ تھا جس کا اظہار آج ہو رہا ہے کہ اسلام کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور نظام کا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا تو سیدنا علی کا بیٹا " مکہ واپسی ، سرحدات پر مصروفِ جہاد ہونے یا یزید کے پاس جا کر اپنا معاملہ طے کرنے کی بات نہ کرتا (بعض روایات میں اضع یدی علی ید یزید کے الفاظ ہیں) سیدنا

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ عقیدت و مروّت کا مظاہرہ کر کے انہیں مدینہ سے جو لوگ کوفہ لائے انہوں نے اب بھی اپنا کام دکھایا اور حضرت حسین کو سفر پر مجبور کیا اور جب اثنائے سفر ان شرائط کو سنا تو سہم گئے۔ اپنے ہزاروں خطوط کی واپسی کا مطالبہ کیا، حضرت حسین کے انکار پر شب خون مار کر انہیں خون میں نہلایا۔ ــــــ عقل کی بات ہے کہ وہ رخ ہوتا جو بیان کیا جاتا ہے تو سیدنا حسین کے قافلہ میں خواتین اور بچے نہ ہوتے، کچھ اور ہوتا، پھر صحابہ کے لئے دفاعی مورچے بنانے والے سُنّی اس پر غور کریں کہ اس انسان کی کی بیعت بہت سے صحابہ نے کی جن میں شیخ الصحابہ سیدنا عبداللہ بن عمر اور ترجمان القرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم شامل ہیں ــــــ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ جیسے فقیہہ النفس اور محدثِ کبیر نے بہت اچھی اور صحیح بات ارشاد فرمائی۔

یزید پر لعنت کے سلسلہ میں ایک تفصیلی سوال کے جواب میں حضرت مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"حدیث صحیح ہے کہ جب کوئی کسی پر لعنت کرتا ہے، اگر وہ شخص قابل لعن کا ہے تو لعن اس پر پڑتی ہے ورنہ لعنت کرنے والے پر رجوع کرتی ہے۔ پس جب تک کسی کا کفر پر مرنا محقق نہ ہو جاوے اس پر لعنت کرنا نہیں چاہیئے کہ اپنے اوپر عود لعنت کا اندیشہ ہے لہٰذا یزید کے وہ افعالِ ناشائستہ ہر چند موجب لعنت کے ہیں مگر جس کو محقق اخبار اور قرائن سے معلوم ہو گیا کہ وہ ان مفاسد سے راضی اور خوش تھا اور ان کو مستحسن اور جائز جانتا تھا اور بدون توبہ کے مر گیا تو وہ لعن کے جواز کے قائل ہیں اور مسئلہ یوں ہی ہے اور جو علماء اس میں تردّد رکھتے ہیں کہ اوّل میں وہ مومن تھا اس کے بعد ان افعال کا وہ مستحل (حلال جاننے والا) تھا یا نہ تھا اور ثابت ہوا یا نہ ہوا، تحقیق نہیں ہوا۔ پس بدون تحقیق اس امر کے لعن جائز نہیں۔ لہٰذا وہ فریق علماء کا بوجہ حدیث منع لعن مسلم کے لعن سے منع کرتے ہیں اور یہ مسئلہ بھی حق ہے۔ پس جواز لعن و عدم جواز کا مدار تاریخ پر ہے۔ اور ہم مقلدین کو احتیاط سکوت میں ہے کیونکہ اگر لعن جائز ہے تو لعن نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، لعن نہ فرض ہے نہ واجب نہ سنّت نہ مستحب محض مباح ہے اور جو وہ محل نہیں تو خود مبتلا ہونا معصیت کا اچھا نہیں۔ فقط واللہ اعلم"

(فتاویٰ رشیدیہ مبوّب صہ ۳۵ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء)

اس دَور کے ضمن کی تاریخ روایات ہم نے پہلی صدی ہجری کے اس قضیہ کے متعلق یہ گفتگو اور اس ضمن میں ایک محقق و محتاط عالم کا فتویٰ اس لئے پیش کیا کہ یہیں سے ہماری تاریخ کو غلط رُخ پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی اور اسی حوالہ سے کہا جاتا ہے کہ بس چند سالوں بعد اسلام

کی تو چھٹی ہوگئی پھر ایک کھیل تھا جو اب تک کھیلا جارہا ہے اور یہ کہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم" کے زمانہائے خیر و برکت کے افراد کے علی الرغم ہم زیادہ دین دار مصلح اور خادم دین وملت ہیں کہ اس گاڑی کو جو پہلی ہی صدی میں راہِ راست سے مڑ گئی تھی، دوبارہ صحیح رُخ پہ ڈال لینے کی فکر کر رہے ہیں؟ اسلاف و اکابر کا حوالہ دے کر ایک جویائے حق کا منہ بند کرنے والے حضرات کم از کم اتنا سوچیں کہ اکابر و اسلاف کی فہرست میں سب سے پہلے صحابہ کرامؓ کے اسماء گرامی آئیں گے جو امت کے لئے معیارِ حق و صداقت ہیں، انہوں نے اور ان کی ذمہ دار شخصیات نے جب یزید کی بیعت کرلی اور کسی قسم کا اقدام نہیں کیا تو اس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ کوئی کھلا کفر اس میں نہ تھا اسلام کی روایات حسنہ کو گزند نہیں پہنچا تھا۔ اس حقیقت کو ہمارے دور کے مشہور آغا خانی رہنما سر آغا خان اوّل نے محمد حارث صاحب کی کتاب "گریٹ دی امیہؓ" کے مقدمہ میں تسلیم کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ "بنو امیہ" کے عہد معدلت گستر جس میں علم و عرفان کے چشمے پھوٹے اور ابلے اس کو عوام کے سامنا لانا بے حد ضروری ہے، لیکن برا ہو تعصبات اور کج روی کا کہ روافض کے ہاتھ مضبوط کرنے کی غیر شعوری کوششیں ہمارے یہاں زوروں پر ہیں، انحصار تاریخ پر ہے، کونسی تاریخ جو مفید مطلب ہو ورنہ تاریخ میں یہ بھی تو ہے کہ:

وقد اورد ابن عساکر احادیث فی ذم یزید بن معاویہ کلّھا موضوعۃ لایصلح شئی منھا (البدایہ صہ ۲۳۱، ج ۸)

مورخ ابن عساکر نے یزید ابن معاویہؓ کی مذمت کے سلسلہ میں جس قدر روایات بیان کی ہیں وہ تمام من گھڑت ہیں ان میں سے ایک بھی تو صحیح نہیں۔

اور صاحب "موضوعاتِ کبیر" جیسے سکّہ بند حنفی محدّث چلّا چلّا کر کہتے ہیں کہ:

"روافض نے سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہل بیت کے فضائل سے متعلق قریب قریب تین لاکھ روایتیں گھڑیں۔" (موضوعاتِ کبیر صہ ۱۰۶)

ساتھ ہی وہ فرماتے ہیں:

"حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور دیگر بنو امیہ خصوصاً یزید، ولید اور مروان بن حکم کی برائی اور خلیفہ منصور و سفاح کی تعریف سے متعلق روایات بھی من گھڑت اور وضعی ہیں۔" (صہ ۱۰۶)

"خیر القرون" کے متعلق کم از کم اس بات کا لحاظ رہنا چاہیئے کہ اس دور کے حضرات کی تعریف

وتوصیف اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول علیہ السّلام نے کی۔ اسلام کی لئے ان کی قربانی وایثار اور قیصر وکسریٰ جیسی متمدّن اور طاقتور حکومتوں سے ٹکر جیسی حقیقتوں کو سامنے رکھیں اور پھر سوچیں کہ آیا سنہ ۶۱ھ کے حوالہ سے جو داستان ہے وہ اگر اسی طرح سچی ہے جو ہمارے اپنے ہمارے حلق سے اتارنے کی فکر میں ہیں تو پھر صحابہ کرام کس موڑ پر کھڑے ہوں گے ؟

قافلۂ اسلام — منزل بمنزل

اسی طرح بنو امیّہ کے بعد ایک لمبے عرصہ تک مسلم سلاطین اور امراء اپنی ہزار شخصی کمزوریوں کے باوصف دینِ اسلام کے معاملہ میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کرتے رہے (جس کی تفصیل کا موقعہ نہیں) رہ گیا معاملہ ان رجالِ دین کا جنہوں نے اپنے تمام ہموم وغموم کو بس ایک ہی "غم" کی نذر کر دیا اور زندگی کے لیل ونہار کو دعوتِ دین وترویجِ دین کے لئے کھپا دیا، ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہم نے بڑی دقّتِ نظر سے ایک مطالعہ کے دوران مختلف صدیوں کے ان رجال دین کی فہرست مرتّب کی ہے جو اس معیار پر بہرطور پورے اترتے ہیں۔ ان رجال دین میں محدّث ومفسّر فقیہہ ومقنن اور مجاہد فی سبیل اللہ سبھی طرح کے لوگ ہیں اور گویا گلدستہ تجدید کے رنگا رنگ پھول۔ گو محض نام گنوانا بعض طبائع پر گراں گذرے گا لیکن ایک تلاش ہے اس لئے اس کا ذکر کیا جارہا ہے تاکہ نوجوانان عزیز ذخیرہ کتب سے ان حضرات کے تراجم (حالاتِ زندگی) پڑھ کر ہمارے دعوٰی کو پرکھ سکیں۔ سنہ ۱۳۲ھ میں خلافت بنو امیّہ کا اختتام ہوتا ہے اور اس سے متصل بنو عباس کی خلافت کی ابتدا ہوتی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں قریب قریب آخری دور تک صحابہ کرام علیہم الرضوان کے وجود سے یہ دنیا معمور رہی اور صرف خطۂ عرب ہی نہیں چین وبلوچستان تک ان حضرات کی بغرض دین آمد ثابت ہے۔ پھر یہی دور کبار تابعین کا ہے، جن کے متعلق ارشاداتِ نبوّت میں بڑے فضائل موجود ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ مظلوم بنو امیّہ نے انہی سالوں (ابتداء سنہ ۱۳۸ھ) اندلس (جسے مغرب کہا جاتا ہے) میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی خدمات کا انکار آسان نہیں۔ اور ایسا کوئی شعبہ چشم ہی کر سکتا ہے — اب ذرا دوسری صدی کے کبار رجال کے محض اسمار گرامی دیکھ لیں۔ پھر اسی تسلسل سے اگلی صدیوں کا ذکر آئے گا۔

عمر بن عبدالعزیز، عطا بن یسار، قاسم بن محمد بن ابی بکر، طاؤس بن کیسان، حسن بصری، مکحول، وہب بن منبہ، حماد الکوفی، شہاب الزہری، مالک بن دینار، ایوب سختیانی، رابعہ بصری، ابن ابی لیلیٰ، جعفر صادق، ہشام (محدّث بصرہ)

امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی، امام زفر، سفیان ثوری، ابراہیم بن ادھم، امام مالک، عبداللہ بن مبارک، قاضی ابویوسف، امام محمد، ابوبکر بن عیاش، وکیل بن الجراح، یحیی بن سعید القطان، سفیان بن عیینہ، معروف کرخی، زیاد (فقیہہ اندلس)، موسیٰ کاظم، حماد بن ابی حنیفہ، عبدالعزیز بن ماجشون رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ان حضرات میں سے اکثر وہ بزرگ ہیں جنہیں تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جبکہ باقی "تبع تابعین" ہیں اور سب کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ تیسری صدی جن حضرات کی خدمات سے روشن و منور ہے، ان کے اسماء گرامی کا نامکمل خاکہ یہ ہے:

امام شافعی، حسن بن زیاد، ابوداؤد طیالسی، فضل بن ربیع، عیسیٰ الغافقی (مفتی اندلس)، یحییٰ بن معین، ابوبکر بن ابی شیبہ، مفتی بلخ ابراہیم البابلی، امام احمد بن حنبل، قاضی یحیی بن اکثم، ذوالنون مصری، سری سقطی، امام بخاری، حسن عسکری، امام مسلم، ابراہیم المزنی، امام ابوداؤد، ابن قتیبہ، امام ترمذی، امام دارمی، ابوزرعہ دمشقی، قاضی ابوبکر شیبانی، جنید بغدادی، محمد بن یزید المحدث، عبران المروزی محدث رحمہم اللہ تعالیٰ۔

چوتھی صدی کے رجالِ دین و خدامِ اسلام

امام نسائی، ابراہیم الخاطی مفسر، فقیہہ مغرب عثمان الحداد، ابویعلی الموصلی، حافظ دولابی، ابوعوانہ (صاحب مسند)، ابونعیم الفقیہہ، ابوالحسن الاشعری، ابوبکر بن الابناری، شیخ کوفہ ابوالحسن، حسان فقیہہ الاموی، حافظ عبدالباقی، ابن حبان، احمد السندی (سندھی) محدث قرطبی، ابن ماسی محدث، ابونصر الصوفی، محدث اندلس محمد بن مفرج، امام دارقطنی، صاحب الصحاح الجوہری، حافظ خلف مغربی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

پانچویں صدی ہجری (اسی صدی میں عظیم درسگاہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی ابتدا ہوئی)

ابوحسین الفقیہہ، قاضی منصور ہراتی، فقیہہ خراسان ابوبکر المروزی، محدث بغداد ہبۃ اللہ، قاضی عبدالوہاب، حافظ کبیر احمد البرقانی، امام المفسرین ابواسحٰق، فقیہہ احناف قدوری، حافظ المستغفری المحدث، فقیہہ موالک ابوذر، شیخ الاسلام ابوعثمان الصابونی، ماوردی صاحب الاحکام السلطانیہ، ابن حزم الظاہری، امام بیہقی، ابوجعفر بن ابی موسیٰ الفقیہہ، امام الحرمین الجوینی، قاضی القضاۃ محمد الناصحی، یوسف بن تاشفین رحمہم اللہ تعالیٰ۔

چھٹی صدی ہجری:

امام غزالی، شیخ الحنفیہ ابوبکر بن الفضل، ابن رشد القرطبی، محدث قرطبہ ابوبحر سفیان، قوام السنۃ اسمٰعیل الحافظ الاصبہانی، حافظ ابوسعد البغدادی، ابوبکر بن العربی، شہرستانی، قاضی ابن رشد، شیخ عبدالقادر جیلانی، نورالدین زنگی، امام سہیلی، صلاح الدین ایوبی، قاضی ابوبکر الاموی، عبدالوہاب الحنفی، ابوعلی الفارسی، رحمہم اللہ تعالیٰ

ساتویں صدی ہجری:

مفسر رازی۔ روزبہان صوفی مفسر، عطار، نجم الدین کبریٰ، قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ اجمیری چشتی، الصوفی ابن العربی، شمس تبریز، عزالدین عبدالسلام دمشقی، شیخ فرید گنج شکر، مولانا روم، سعدی شیرازی، حضرۃ الشیخ صابر کلیری رحمہم اللہ تعالیٰ۔

آٹھویں صدی ہجری:

ابن دقیق العید، بوعلی قلندر پانی پتی، خواجہ نظام الدین دہلوی، امام ابن تیمیہ، امیر خسرو، ابن قدامہ حنبلی، ذہبی، امام ابن قیم، مفسر سبکی، نصیرالدین چراغ دہلوی، فقیہ عماد، مخدوم شرف الدین بہاری، حضرت جہانیاں جہاں گشت (اُچ بہاولپور) شیخ زادہ الحنفی رحمہم اللہ تعالیٰ

نویں صدی ہجری:

خواجہ گیسو دراز، محدث بعلبک تاج الدین، قاضی شرف الدین یمانی، علامہ مقدسی، حافظ ابن حجر عسقلانی، خواجہ بہاءالدین نقشبند، شہاب الدین احمد جونپوری، ابن امیر الحاج، خواجہ عبیداللہ احرار نقشبندی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

دسویں صدی ہجری:

ملا زادہ سمرقندی فقیہ احناف، امام سیوطی، امام سمہودی، صاحب خزانۃ الفتاویٰ، قسطلانی شارح البخاری، قاضی نجم الدین شافعی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، طاش کبریٰ زادہ، شیخ زادہ حنفی، شیخ علی متقی ہندی، غزالی احمد آبادی، مولانا عرفی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

گیارہویں صدی ہجری:

حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی الشیخ احمد سرہندی، حضرت میاں میر لاہوری، شیخ محب اللہ الٰہ آبادی، حضرت شیخ عبدالحق دہلوی، حاجی خلیفہ، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

بارہویں صدی ہجری:

حضرت کلیم اللہ جہان آبادی، امام شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت شاہ عبدالحکیم لاہوری، نواب نجیب الدولہ، حافظ رحمت خان (مجاہد کبیر)، حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید، خواجہ میر درد۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تیرھویں صدی ہجری:

بیہقیٔ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ مجاہد امت شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی، بحرالعلوم عبدالعلی، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالحق، امیر کبیر حضرت سید احمد شہید، مجاہد کبیر شاہ اسمٰعیل شہید، شاہ رفیع الدین، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا فضل امام، مولانا فضل حق خیر آبادی۔

چودھویں صدی ہجری:

مولانا عبدالحی فرنگی محلی، نواب صدیق حسن خان، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، سید جمال الدین افغانی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، فقیہ العصر مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا میاں نذیر حسین دہلوی، انور پاشا، جمال پاشا، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا شبلی نعمانی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، علامہ رشید رضا مصری، الشیخ محمد عبدہٗ، مولانا عبدالعزیز گوجرانوالہ، مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری، مولانا محمد اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، سید سلیمان ندوی، مولانا محمد میاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا برکات احمد ٹونکی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری، شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (وغیرہم) رحمہم اللہ تعالیٰ۔

زندہ افراد شخصیات کی ضرورت کیوں؟ یہ فہرست ظاہر ہے نہ آخری ہے نہ حتمی، ہم نے تو اپنے محدود مطالعہ کے پیش نظر "رجالِ دین" میں سے چند حضرات کے نام لکھے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی اس سرزمین پر ہر دور

ہر قرن اور علاقہ میں ایسے حضرات وافر تعداد میں موجود رہے جنہوں نے دینِ اسلام کی خدمت کو اپنا مقصدِ زندگی بنایا۔ بہت سے اہلِ علم و اہلِ قلم نے اس سلسلہ میں مفید تصانیف و تالیفات فراہم کی ہیں۔ جن میں ایسے رجالِ کار کا ذکر ہے، اس دور کے نامور اہلِ قلم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، جن کا حضرت الامیر السید احمد شہید قدس سرہ سے خاندانی تعلق ہے) نے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے نام سے پانچ ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں، جبکہ ایسے رجال دین کے متعلق ان کی مستقل تصانیف اور مضامین اس کے علاوہ ہیں۔ مولانا کا ایک مضمون ان سطور کی تحریر کے وقت اچانک نظر سے گذرا، جو لکھنؤ کے ہی ایک دوسرے مصلح عالم مولانا محمد منظور نعمانی کے رسالہ "الفرقان" کی اشاعت خصوصی محرم، ربیعین و جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ میں "تاریخ اسلام میں اصلاح و انقلاب کی جد وجہد اور اس کی اہم شخصیتیں" کے عنوان سے چھپا۔ الفرقان کے معروف سائز کے ۳۲ صفحات پر مشتمل یہ مضمون بڑا وقیع ہے۔ یہ مضمون دراصل بنیاد ہے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے سلسلہ کی جو بعد میں مولانا کے قلم سے نکلی۔ حضور علیہ السلام آخری نبی ہیں لیکن آپ کے دین کا معاملہ ایسا ہے کہ دنیا سے ظاہری طور پر آپ کے تشریف لے جانے کے بعد بھی اسے باقی رہنا ہے، اس وقت تک جب تک اللہ چاہیں گے، پھر یہ کہ زمانہ متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ آئے دن نئے نئے مسائل کا پیدا ہونا قدرتی سی بات ہے، اس لئے بقول مولانا یہ سارا سلسلہ دعوت و تجدید اسلام کی بقا اور اس کے تسلسل کے قدرتی انتظامات کا حصہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کی تاریخ میں غیر انبیاء میں اس نوع کی شخصیات کا موجود نہ ہونا اور اس امت میں غیر انبیاء میں سے ایسی شخصیات کا موجود ہونا قدرتی بات ہے۔

وہ فرماتے ہیں :-

"دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا اور اپنی خصوصیات زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں۔ اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوتِ عمل پیدا کر دیں۔ زندگی کے تقاضے ہر وقت جوان ہیں۔ مادیت کا درخت سدا بہار ہے۔ نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتاً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُر جوش داعیوں اور کامیاب

مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ جنہوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔

اگرچہ پیر ہے مومن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابلہ جب تک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی۔ تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ (الفرقان صـ۱۴۱)

محدثین اور فقہاءِ امت کے دو محسن طبقے

امت کے بڑھتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے اقتدار کے پیشِ نظر دو فوری ضرورتیں ایسی تھیں جو اگر پوری نہ ہوتیں تو دین اسلام دم توڑ کر رہ جاتا اور ایسا ہوتا "وعدہ حفاظتِ ربانی" کے منافی ہوتا۔ ان دو ضرورتوں میں سے پہلی ضرورت مولانا کے نزدیک (اور یہ بالکل صحیح ہے) حدیث و سنّت کے سرمایہ کی حفاظت و تدوین کی تھی جو کلام الٰہی کے سمجھنے کا بنیادی ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ "نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا۔

اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچہ کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا۔ حدیثِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سب سے زیادہ مفصّل اور مستند سیرت ہے، وہ زمانہ نبوّت کے ۲۳ برسوں کا ایک طرح کا روزنامچہ ہے جو کسی پیغمبر کو حاصل نہ تھا، اس کا ضائع ہو جانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا۔ (الفرقان صـ۱۶۲)

جو لوگ "محض قرآن" کے کافی ہونے کے دعویدار تھے یا ہیں یا جن کا خیال یہ تھا یا یہ ہے کہ حدیث و سنّت سے صرف نظر کر کے قرآن کی تہہ تک پہنچنا ممکن ہے، انہوں نے کل بھی ٹھوکر کھائی آج بھی ٹھوکر کھا رہے ہیں، اسی طرح فقہ و قانونِ شریعت اور استنباط و اجتہاد سے ناک منہ چڑھانے والے اور "قرآن و سنّت" کو کافی شافی سمجھنے والے کل بھی تہی دامن تھے اور آج بھی وہی حال ہے، مولانا کے بقول:

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی۔ قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے اصول و کلیاتِ موجود ہیں اور ان سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بیحد متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے

کے لئے اور ہر نئی حالت اور ضرورت کے لئے ان کی ترجمانی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔ (صد ۱۶۲)

پھر انہوں نے بڑی تفصیل سے ان دو طبقات محدثین و فقہاء کا ذکر کیا اور گویا یہ دونوں طبقے اسلام کی تجدیدی سلسلہ کی بہت اہم کڑیاں ہیں۔ محدثین کی بلند ہمتی اور ان کی جفاکشی کا کوئی ٹھکانہ ہے؟ انہوں "فن اسماء الرجال" ہی کے سلسلے میں جو کام کیا وہ ہی اتنا عظیم ہے کہ اس کی مثال انسانی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ دشمن اعترافِ حقیقت پر مجبور رہے:

کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہو۔

(ڈاکٹر اسپرنگر مقدمہ انگریزی ایڈیشن الاصابۃ فی احوال الصحابۃ صد ۱۶۳)

محدثین کی احتیاط و امانت، قوتِ حافظہ اور استحضار کس کس بات کا ذکر ہو، واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ امت کے محسن، اس کے سرمایہ علمی کے محافظ اور اس کی روایات و اقدار کے نگہبان ہیں ــــ

ــــ رہ گیا معاملہ فقہ کی تدوین کا تو مقبول مولانا:

"یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل تھا اور اس امت کی اقبال مندی، کہ اس کارِ عظیم کے لئے ایسے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم پر تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں۔ پھر ان میں سے چار شخصیتیں ــــ امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰) امام مالک (م ۱۷۹) امام شافعی (م ۲۰۴) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱) جو فقہ کے چار دبستانِ فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے اپنے تعلق باللہ، للّٰہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبہ خدمت میں خاص طور ممتاز ہیں۔ ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انہوں نے دنیا کے کسی جاہ و عزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا۔ (صد ۱۶۶ - ۱۶۷)

تدوینِ فقہ اور فقہاء کی ان کاوشوں کا فائدہ یہ ہوا کہ:

"اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمہ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہونا اس دین کی زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی۔ ان کی کوششوں اور

ذہانتوں سے اس امت کی عملی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہوگئی اور وہ اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی جس کی قومیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں، انہوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کردیں اور ایسے اصول مرتب کردیئے جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل و مشکلات کے حل کرنے میں مدد کی جاسکتی ہے اور عام اور معتدل زندگی کو باقاعدگی اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جاسکتا ہے۔" (ص ۱۶۸)

—جاری ہے—

بقیہ : حالاتِ حاضرہ پر ایک مبسوط تبصرہ

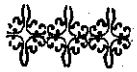

ہو۔ اس لیے کہ دستورِ پاکستان کے ضمن میں محض اپنی صواب دید کی بنا پر فیصلے کرنے کا آپ کو کوئی اخلاقی یا قانونی حق حاصل نہیں ہے!

مجھے اندیشہ ہے کہ اگر مذکرہ بالا دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کی بجائے موجودہ کوشش جاری رکھی گئی تو ملک میں ۶۹-۷۰ء کے سے حالات دوبارہ پیدا ہوکر رہیں گے جن کے نتیجے میں ملک کی بقاء اور سالمیت کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اس ملک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے!

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ

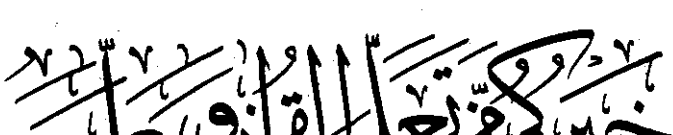

Coca-Cola is it!

TRADE-MARK REGD.

"COCA-COLA" AND "COKE" ARE THE REGISTERED TRADE-MARKS WHICH IDENTIFY THE SAME PRODUCT OF THE COCA-COLA COMPANY.

paragon

پشاور میں تنظیم اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع

تنظیم اسلامی کے پچھلے سالانہ اجتماع کے موقع پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ آئندہ سالانہ اجتماع چھ سات دن کی بجائے صرف تین دن کا ہوگا اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اور مختلف علاقوں میں تنظیم کی دعوت کو وسعت دینے کے لئے علاقائی سطح پر اجتماعات منعقد کئے جائیں گے - اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پانچ شہروں کا انتخاب کیا گیا جہاں پر ترتیب وار اجتماعات منعقد کرنے کے انتظامات کیے گئے اس ترتیب کے لحاظ سے پہلا اجتماع راولپنڈی میں دوسرا کوئٹہ میں منعقد ہوا جبکہ پشاور اس ترتیب کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر تھا - حیدرآباد اور ملتان بالترتیب چوتھے اور پانچویں نمبر پر ہیں -

پشاور کے علاقائی اجتماع کے لئے ۲۴ تا ۲۷ ستمبر کی تاریخوں کا تعین کیا گیا۔ پشاور میں اجتماع کے انعقاد کی تیاریوں کے سلسلے میں رفقاءِ پشاور نے آپس میں صلاح مشورے کے لئے متعدد خصوصی اجتماعات منعقد کئے اور کافی سوچ بچار کے بعد مختلف کاموں کو آپس میں تقسیم کرکے اُن کے لئے انتظامی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں - اس طرح تین کمیٹیاں وجود میں آئیں - استقبالیہ کمیٹی ، انتظامی کمیٹی برائے طعام جبکہ ان تینوں کمیٹیوں کے ناظمین پر مشتمل ایک آرگنائزنگ کمیٹی بنائی گئی - جسکے ناظم پشاور کے امیر جناب اشفاق احمد میر صاحب تھے - اجتماع پشاور یونیورسٹی سے ملحقہ مدرسے مرکزِ علوم اسلامیہ راحت آباد میں ہونا قرار پایا جسکی تشہیر کے لئے تنظیم کے مرکز کی جانب سے چار ہزار ہینڈ بل چھپوا کر بھجوائے ______ جبکہ پشاور کے ایک صاحبِ خیر ______ پروپرائیٹر جالندھر سویٹ ہاؤس نے (۱۲۰۰) بارہ سو فل سائز کے پوسٹرز چھپوا کر دیئے اور مقامی تنظیم نے شہر، صدر اور یونیورسٹی کے متعدد مقامات پر بینرز لگائے اس کے علاوہ مقامی اخبارات میں خبریں بھی چھپوائی گئیں اس طرح تشہیر کے تمام ممکنہ ذرائع اختیار کئے گئے -

اجتماع سے ایک دن پہلے مرکز سے چھ افراد پر مشتمل ایک ہراول دستہ چودھری

غلام محمد صاحب قیم تنظیم اسلامی کی قیادت میں انتظامات کا جائزہ لینے اور کام کی نگرانی کے لئے پشاور پہنچ گیا ان تمام اصحاب کو سب سے پہلے اجتماع گاہ پہنچایا گیا اور تمام انتظامات سے آگاہ کیا گیا جس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور چند مفید مشورے دیے۔

۲۵ ستمبر کو اجتماع کا آغاز امیر محترم کے خطاب بعنوان "اسلام کا فلسفہ شہادت" سے ہوا یہ خطاب پشاور شہر کے وسط میں واقع جامع مسجد ہشت نگری میں بعد از نماز عشاء ہوا اس خطاب کے موقع پر تاریخی ہجوم دیکھنے میں آیا اردگرد کی تمام سڑکوں کو بند کر کے دریاں وغیرہ بچھائی گئی تھیں لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں کو جگہ کی تنگی کی وجہ سے واپس جانا پڑا یا پھر کھڑے ہو کر سننا پڑا یہ خطاب تقریباً دو گھنٹے جاری رہا باہر سے آنے والے تمام رفقاء کو بھی ریلوے سٹیشن اور بسوں کے اڈے سے سیدھا جامع مسجد ہشت نگری لیجایا گیا اور پھر وہاں سے خطاب کے اختتام پر رات ۱۱ بجے تمام رفقاء کو بسوں کے ذریعے اجتماع گاہ پہنچایا گیا جہاں پر انہیں فوراً ہی کھانا کھلایا گیا اور اسکے بعد تمام مہمان ہونے کی تیاری کرنے لگے۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کے درس دیا اور پھر ناشتے کے بعد نو بجے تربیتی اجتماع کا آغاز ہوا جس میں چوہدری غلام محمد صاحب اور عبدالرزاق صاحب نے اقامت دین کے لئے جدوجہد کرنیوالی جماعت کے اوصاف اور تنظیمی مسائل کے بارے میں قرآن حکیم کی مختلف آیات کا درس دیا جسے امیر محترم نے منتخب نصاب کی شکل میں تیار کیا ہے۔

چائے کے وقفے کے بعد امیر محترم نے ان دروس کے بارے میں مختلف سوالات کے جوابات دیئے اور مختلف تنظیمی امور کے بارے میں اظہار خیال فرمایا۔ اس طرح یہ سلسلہ سوا بجے تک جاری رہا۔

عصر تا مغرب کا وقت باہمی تعارف اور ملاقاتوں کے لئے مخصوص تھا جبکہ مغرب کے بعد امیر محترم نے سورۃ صف کا درس دیا اور اسکی ابتدائی چار آیات کی تشریح اور تفسیر بیان فرمائی جسے حاضرین نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا۔

۲۶ ستمبر کو بھی صبح کی نماز کے بعد ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا درس ہوا

جسکے بعد ناشتہ ہوا اور پھر نو بجے تربیتی اجتماع کا آغاز ہوا جس میں حسبِ سابق چوہدری صاحب اور عبدالرزاق صاحب نے درس کے سلسلے کو آگے بڑھایا اور چائے کے وقفے کے بعد امیرِ محترم نے سوالات کے جوابات دیئے اور تنظیمی امور کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا اور اس طرح یہ سلسلہ بھی حسبِ سابق سوا بجے تک جاری رہا جبکہ عصر کے بعد پشاور کے تمام رفقاء کا فرداً فرداً تعارف کروایا گیا اور مغرب کے بعد امیرِ محترم نے سورۃ صف کے درس کا دوسرا حصہ ارشاد فرمایا اس درس کو بھی بہت توجہ اور دلچسپی سے سُنا گیا اور بہت زیادہ سراہا گیا۔

۲۷ ستمبر کو صبح نماز کے بعد چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے درس دیا اور ناشتے کے بعد باہر سے آئے ہوئے مہمان رفقاء رخصت ہونا شروع ہو گئے جبکہ نو بجے سے گیارہ بجے تک سوال وجواب کی نشست ہوئی جس میں کافی لوگوں نے شرکت کی اور سوالات کئے جنکے جوابات امیرِ محترم نے تسلی بخش طور سے دیئے۔ اُس دن چونکے جمعہ کا دن تھا لہٰذا امیرِ محترم کے جمعہ کے خطاب کیلئے جامع مسجد گنج علی خان میں انتظام کیا گیا تھا جس کے لئے کوئی خاص قابلِ ذکر تشہیر نہیں کی گئی تھی لیکن اُسکے باوجود ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور بڑی توجہ سے امیرِ محترم کا خطاب سنا اور اس خطاب کے ساتھ ہی پشاور کا اجتماع بھی بخیر وخوبی بفضلِ تعالےٰ انجام پذیر ہوا۔ باہر سے آئے ہوئے تمام رفقاء واپس اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے اور مقامی رفقاء نے اپنے اپنے کاموں کو سمیٹنا شروع کیا۔ اس اجتماع میں لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، فیصل آباد اور باجوڑ سے آئے ہوئے رفقاء شریک ہوئے۔

اس اجتماع کے انعقاد کے سلسلے میں ہم جناب راحت گل صاحب مہتمم مرکز علوم اسلامیہ کے بہت ہی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اجتماع کے لئے ہمیں اپنے مدرسے میں جگہ دی اور تمام شرکائے اجتماع کو دعوتِ طعام بھی دی۔

امیرِ تنظیم کا دورۂ پشاور، ۵ تا ۷، اکتوبر ۸۵ء

پشاور کے علاقائی اجتماع کے سلسلے میں جب امیرِ تنظیم پشاور تشریف لائے

تو اس دوران شعبۂ فلسفہ کے طالب علم جناب موسیٰ وزیر صاحب نے امیرِ محترم سے ملاقات کی اور شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر سلیم صاحب کی طرف سے امیرِ محترم کو پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے زیرِ اہتمام خطاب کی دعوت دی جسے امیرِ محترم نے قبول کر لیا اور اپنے آئندہ دورے کے موقع پر خطاب کا وعدہ فرمایا۔

اس کے چند دن بعد ہی پاکستان اکیڈمی برائے دیہی ترقی کی دعوت پر ۵ اکتوبر کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پشاور تشریف لائے۔ امیرِ محترم اپنی پشاور آمد کے فوراً بعد پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ پشتو کے چیئرمین اور گومل یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب پریشان خٹک صاحب کے ہاں تشریف لے گئے جہاں پر وہ رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ یونیورسٹی کے چند اور پروفیسر صاحبان بھی وہاں موجود تھے۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے وقت امیرِ محترم تین رفقاء کے ہمراہ پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سابقہ چیئرمین اور مشہور عالمِ دین جناب مولانا اشرف صاحب سے ملاقات کی غرض سے اُنکی قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور وہاں سے صبح سات بجے واپس اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے۔

اُسی دن صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک امیرِ محترم نے NIPA کے افسران سے مختلف موضوعات پر وقفے وقفے سے خطاب فرمایا ——— امیرِ محترم وہاں سے فراغت کے بعد اشفاق میر صاحب کے گھر منتقل ہو گئے اور بعد از نمازِ عصر مولانا اسرائیل صاحب اور مولانا راحت گل صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے جبکہ مغرب کے بعد رفقاء کا خصوصی اجتماع ہوا جس میں امیرِ محترم نے بھی شرکت فرمائی اور پشاور کی تنظیم کے بارے میں گفتگو فرمائی اور ہدایات دیں۔ اس کے بعد امیرِ محترم پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر جناب انتصار صاحب کے گھر تشریف لے گئے جہاں پر اُنہیں رات کے کھانے کی دعوت دی گئی تھی۔ ۷۔ اکتوبر کو دن گیارہ بجے امیرِ محترم شعبۂ فلسفہ تشریف لے گئے جہاں پر یونیورسٹی کے شیر پاؤ ہال میں امیرِ محترم نے "ایمان باللہ" کے موضوع پر خطاب فرمایا

اس تقریب کی صدارت پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب رشید احمد

طاہر خیلی نے کی ۔ شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر سلیم صاحب نے تمام شرکاء سے امیر محترم کا تعارف کروایا اور روایتی انداز میں امیر محترم کے مختصر تعارف کے بعد امیر محترم کو خطاب کی دعوت دی گئی ۔

امیر محترم نے سب سے پہلے عقیدۂ توحید کی تشریح کی اور اس ضمن میں قدیم اور جدید فلاسفہ اور پیغمبروں کی تعلیمات کا موازنہ فرمایا اور دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ۔

کہ اس کائنات کا وجود ایک خالق حقیقی کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور اُس کے بعد ایمانیات ثلاثہ کا ذکر فرمایا اور آخر میں نظریۂ توحید کے لوازمات اور اُس کے معاشرے پہ اثرات کا پورے دلائل کے ساتھ ذکر فرمایا ۔ امیر محترم کا یہ ایمان افروز اور فکر انگیز خطاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء و طالبات نے بڑی توجہ اور دلجمعی سے سُنا ۔ اس تقریب کی تشہیر کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا تھا اس کے باوجود شیر پاؤ ہال میں گنجائش سے زیادہ لوگ موجود تھے اور دیواروں کے ساتھ کھڑے ہو کر سُن رہے تھے طلباء کے اس حُسن ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے امیر محترم سے ماہانہ خطاب کی درخواست کی جسے امیر محترم نے قبول کر لیا ۔ آخر میں میزبانوں کی جانب سے مہمانوں کے لئے چائے کا انتظام کیا گیا تھا ۔ اس تقریب کے انعقاد کے لئے ہم پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر سلیم صاحب اور دوسرے اساتذہ کے علاوہ طلباً بالخصوص موسیٰ وزیر صاحب کے انتہائی شکر گزار ہیں ۔

اس کے علاوہ ہم پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب رشید احمد طاہر خیلی صاحب کے بھی انتہائی مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس تقریب کی صدارت فرمائی اور امیر محترم کو پشاور یونیورسٹی کی جانب سے ماہانہ خطاب کی دعوت دی ۔

مرتب :

راجہ سردار احمد قیم تنظیم اسلامی پشاور

سنّتِ نبویؐ کی پیروی فلاح دارین ہے

اراک

حضورِ اکرمؐ کی پسندیدہ مسواک تھی

اراک جسے مقامی زبان میں پیلو (جال) اور سائنسی زبان میں سالویڈور پرسیکا کہتے ہیں ان قدرتی عناصر کا خزینہ ہے جو دانتوں اور مسوڑھوں کو مضبوط اور صحت مند بناتے ہیں۔

اراک ٹوتھ پیسٹ

اراک کی قدرتی کیمیائی اجزاء سے تیار کیا گیا ہے جو دورِ جدید میں اراک کی مسواک کے تمام فائدے پہنچاتا ہے۔

مصنوعی کیمیائی اجزاء سے تیار کیے ہوئے ٹوتھ پیسٹ کے بجائے قدرتی عطیے پر اعتماد کیجیے۔

اراک ٹوتھ پیسٹ استعمال کیجیے
دانت چمکدار۔ سانس خوشگوار

SHAREX

شاریکس لیبارٹریز لمیٹڈ

”گاہے گاہے باز خواں ۔ ۔ ۔ ۔“

مُتّحدہ پاکستان

کی دستوری اور سیاسی پیچیدگیاں

اور

سقوطِ مشرقی پاکستان

اور

موجودہ مارشل لاء کی طوالت

اور

بچے کھچے پاکستان کا مُستقبل

*

ڈاکٹر اسرار احمد

کی جون ۱۹۶۹ء دسمبر ۱۹۷۱ء، فروری ۱۹۷۲ء اور دسمبر ۱۹۷۳ء کی بعض تحریریں

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اس سوچ میں غنچے سُوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہوگا ، دستورِ بہاراں کیا ہوگا؟

(۱)

مُتحدہ پاکستان

دستوری، سیاسی اور داخلی و خارجی پیچیدگیاں

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق جولائی ۱۹۶۹ء

(۲)

"حیراں ہُوں دِل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں!"

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق ستمبر اکتوبر ۱۹۶۹ء

(۳)

"وقتِ دُعا ہے!"

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق دسمبر ۱۹۷۱ء

(۴)

سقُوطِ مشرقی پاکستان

اور ذلّت آمیز شکست کے اسباب و عوامل

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق جنوری فروری ۱۹۷۲ء

(۵)

موجُودہ مارشل لائی طوالت

اور بچے کھچے پاکستان کے مُستقبل کے لیے خطرات

مدیر "میثاق" کا صدرِ مملکت ضیاء الحق صاحب کے نام خط۔
تحریر ۲۷ دسمبر ۱۹۸۲ء۔ شائع شدہ "میثاق" ستمبر ۱۹۸۳ء

(۱)

مُتّحدہ پاکستان

دستوری وسیاسی اور داخلی وخارجی پیچیدگیاں

"تذکرہ وتبصرہ" میثاق جولائی ۱۹۶۹ء

میڈیکل کالج لاہور میں اپنے پانچ سالہ عرصۂ تعلیم کے دوران راقم الحروف نے معمارِ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کا حسب ذیل فقرہ جو کالج ہال کی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہوگا:

"God has given us a golden opportunity to show our worth as architects of a new State and let it not be said that we did not prove equal to the task."

یعنی "(مملکتِ خداداد پاکستان کی صورت میں) اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نئی مملکت کے معماروں کی حیثیت سے اپنی اہلیت وصلاحیت کے اظہار کا ایک سنہری موقع عطا فرمایا ہے اور دیکھنا! ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیا یہ کہے کہ ہم اس عظیم کام کے اہل ثابت نہیں ہو سکے!"

پھر کچھ تو اس بنا پر کہ فقرہ بجائے خود نہایت جاندار تھا اور اس کے الفاظ کا در وبست نہایت موزوں تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا اور ہر پاکستانی کے دل میں ایک "ولولۂ تازہ" موجزن تھا اور اس جملے میں گویا ہر شخص کو اپنے ہی دل کی صدا سنائی دیتی تھی۔ یہ فقرہ کچھ اس طرح ذہن میں ثبت ہو گیا تھا کہ آج تک من وعن یاد ہے۔

لیکن ـــــ افسوس ـــــ کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا، مملکت خداداد پاکستان بزبان حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی ومؤسس کا خدشہ ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسّر نہ آ سکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق "اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ

بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے [1] ——— بائیس سال گذر جانے کے بعد بھی اگر کسی مملکت کا "اساسی نظریہ" تک زیرِ بحث چلا آ رہا ہو اور دستور سازی ہنوز معرضِ بحث میں ہو بلکہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے بارے میں نئی نئی بحثیں اٹھ رہی ہوں اور ردّ و قدح اور تکرار و نزاع کی نت نئی صورتیں پیدا ہو رہی ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساری مادّی ترقیوں اور معاشی منصوبہ بندیوں کے باوجود ابھی مملکت کی اصل تعمیر کی ابھی ابتدا بھی نہیں ہوئی اور قومی تعمیرِ نو کا کام شروع بھی نہیں ہو سکا۔

پاکستان کی زندگی کے بائیس سال درحقیقت گیارہ گیارہ سالوں کے دو مساوی ادوار پر مشتمل ہیں۔ پہلے گیارہ سالوں (۱۹۴۷ء/۵۸ء) کے دوران پاکستان کے سیاست دانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی ——— اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن بہت جلد اس نے ایک سابق فوجی کے زیرِ سربراہی ایک خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی۔ اور اہلِ سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظّم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا چنانچہ دوسرا دور (۱۹۵۸ء/۶۹ء) درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی ——— لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمّہ داری کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لئے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا ——— اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ——— ملک و ملّت کے پاس ایک ہی منظّم ادارہ باقی رہ گیا ہے یعنی فوج، چنانچہ بدرجۂ مجبوری پھر اسی کو آگے بڑھ کر ملک و ملّت کی زمام

---

[1] "They build a Nation's pillars deep, and lift them to sky!"

اپنے ہاتھ میں لینی پڑی ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ شرافت، دیانت، امانت، حُبِّ وطن، حُبِّ قوم، ایثار، قربانی، احساس فرض اور تن دہی و جاں فشانی کے اوصاف کے اعتبار سے قوم اپنے اِس طبقے پر مکمل اعتماد بھی کرتی ہے ——— لیکن ظاہر ہے کہ اس ادارے کا اصل فریضہ دفاعِ وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمّہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رُخ پر جا رہے ہیں اس کے پیشِ نظر مستقبل میں دفاعِ وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاعِ وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور یہ خطرہ (Risk) اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف ملک کی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی صفوں میں خاصی سرگرمی اور ہلچل کے باوجود تا حال کوئی ایسی صورت حال سامنے نہیں آ رہی ہے کہ یہ امید کی جا سکے کہ اگر حکومت ان کے حوالے کر دی جائے تو یہ اطمینان بخش طور پر اسے سنبھال سکیں گی اور دوبارہ وہی صورتِ حال پیدا نہ ہو جائے گی جس کے پیشِ نظر مارشل لاء کا نفاذ لازمی ہو گیا تھا۔

الغرض ——— نظریاتی اور دستوری بحثوں اور مناقشوں پر مستزاد یہ ہے کہ وہ نازک صورت حال اور عظیم الجھاؤ (Dilemma) جس سے مملکتِ خداداد پاکستان اس وقت دوچار ہے۔

اس صورتِ حال کے اسباب میں سے تین عوامل تو ہماری گذشتہ نصف صدی کی تاریخ سے متعلق ہیں اور تین پیچیدگیاں وہ ہیں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوئیں اور مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

تاریخی عوامل کے بارے میں ہم ان صفحات میں مفصل لکھ چکے ہیں اور یہاں ان کے مفصل اعادے کی گنجائش بھی نہیں۔ وہ مختصراً یہ ہیں کہ:-

اوّلاً ——— آج سے تقریباً نصف صدی قبل ملّت اسلامیہ ہند و پاک کی قوتیں اور توانائیاں منقسم ہو گئیں اور قومی لائحہ عمل اور پالیسی سے اختلاف کی بنا پر علماء کا وہ طبقہ جو ماضی میں قوم کا اصل رہنما رہا تھا اور جس میں مخلص اور بے لوث عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اپنے متوسّلین سمیت قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ کر رہ گیا اور اس طرح قوم اپنی بہترین متاع سے محروم

ہوگئی۔ رہا یہ سوال کہ یہ حادثہ کیسے اور کیوں واقع ہوا تو یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر گفتگو کی اس وقت گنجائش نہیں (ویسے ہم میثاقِ مارچ ۱۹۶۷ء) کے 'تذکرہ و تبصرہ' میں اس موضوع پر مفصل کلام کر چکے ہیں[1]۔

ثانیاً ـــــــ اسلامیانِ ہند کی قومی قیادت قومی تعمیرِ نو اور قوم کی تنظیم و تربیت کے ضمن میں ہرگز کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر سکی۔ اب چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ اسے اس کا وقت نہیں ملا۔ چاہے یہ کہ اس نے اس کی جانب توجہ نہیں کی۔ فرق کوئی واقع نہیں ہوتا۔ اور واقعہ بہرحال یہی ہے کہ قومی تحریک نے بس ایک ہنگامی اور فوری سی ضرورت کو تو ضرور پورا کر دیا لیکن اس نے قوم کو نہ کوئی قومی تنظیم دی نہ قومی قیادت!

ثالثاً ـــــــ قیامِ پاکستان سے تقریباً ایک دہائی قبل ایک اور صاحب نے 'قومی تحریک' کو مطعون کر کے ایک "بین الاقوامی اور خالص اصولی اسلامی تحریک" کے نام پر قوم کے جسد سے مخلص کارکنوں کا ایک اور ٹکڑا کاٹ لیا اور قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اسی ٹکڑی کی مدد سے "اسلامی دستور" اور "انقلابِ قیادت" کے نعروں کے ساتھ قومی قیادت پر ایک زوردار شبخون مارا ـــــــ نتیجۃً قومی قیادت کے رہے سہے مخلص عناصر کو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ایک جانب قومی تنظیم کے اندرونی خلفشار کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری طرف ان صاحب کی بیرونی یلغار کا۔ اس دوگونہ کش مکش نے قومی قیادت کے ان مخلص عناصر کو کمزور کرتے کرتے بالآخر بالکل میدان سے خارج کر دیا (Knock out) اور میدان بالکلیہ ان لوگوں کے ہاتھ آ گیا جن کا کوئی دین تھا تو خالص اغراض پرستی اور ایمان تھا تو محض مفادات پر اور جو کبھی یونینسٹ ہوتے تھے، کبھی لیگی پھر کبھی ری پبلکن بن جاتے تھے اور کبھی پھر لیگی! ـــــــ ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں پاکستان کی قومی سیاست کے تابوت میں وہ آخری کیل ٹھکی جس کے بعد خالص بیوروکریسی کا دور شروع ہو گیا۔

ان تین تاریخی عوامل پر مستزاد ہیں۔ وہ تین پیچیدگیاں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے ـــــــ آئندہ ہم ان کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] یہ تحریر اب 'اسلام اور پاکستان' نامی کتاب میں شامل ہے۔

ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دور دراز خطوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالتِ جنگ ہی میں نہیں عین حالتِ امن میں بھی ایک بالقوہ دشمن (Potential enemy) کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار ہی سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اعتبار سے تو یہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور محیر العقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کر دیا ہے ـــــ یعنی ایک تو اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدّن، زبان، لباس، طرزِ بود و باش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطّوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروّجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا ـــــ اور دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطّہ رقبہ محل وقوع، دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات، الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے وہ بلحاظ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ ایک نہایت جاندار، فعّال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لئے ہوئے ہے، تعدادِ نفوسِ انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطّے سے برتر ہے ـــــ ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدّت میں بھی پاکستان

لہ ممکن ہے ہماری یہ عریاں حقیقت نگاری بعض لوگوں کو ناگوار معلوم ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی سیاسی کارکن اس حقیقت کے اظہار کی جرأت نہیں کرے گا تاہم ہمارے نزدیک واقعہ یہی ہے اور اسے ذہنی طور پر قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روزِ اوّل کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دور دور تک اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملّی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطّوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیشِ نظر رہنی ضروری ہے۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس 'سنجوگ' کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی پر ہی منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملہ میں جبر و تشدّد کا ردِّ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس 'آزاد مرضی' کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملّی احساسات پر ہے اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے۔ اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی 'علیحدگی' کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکان غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا؟ ـــــ اگر وہ واقعتہً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خودمختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی خواہش کے آڑے نہیں آسکتی ـــــ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدّس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دینِ فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے کہ اگرچہ طلاق، حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلّق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے ـــــ بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعتہً یہ محسوس

کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کے بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل 'معطل' رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا ——— اور اب مزید وضاحت سے کہے دیتے ہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین "مساوات" کا مفہوم اگر یہ ہے کہ دارالحکومت ایک مغربی پاکستان میں ہو اور دوسرا مشرقی پاکستان میں اور مرکزی حکومت چھ ماہ وہاں رہے اور چھ ماہ یہاں اور دفاعی اخراجات میں بھی لازماً کامل مساوات برتی جائے تو یہ خالص احمقانہ تصور ہے۔ ایسی مساوات خاندان کے مختصر سے ادارے میں بھی نہیں چل سکتی کجا یہ کہ ایک عظیم مملکت جو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے دوچار ہو، اس کے انتظام و انصرام میں برتی جا سکے اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ دونوں خطے آزاد ہو کر اپنے اپنے بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کی فکر کریں۔!

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہش ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوں اور اگرچہ ماضی قریب میں ان پر یہ 'بہتان' کثرت سے لگایا گیا ہے کہ ان میں 'علیحدگی پسندی' کا رجحان موجود ہے۔ ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان حقائق و واقعات اور موجود الوقت ظروف و احوال سے اتنے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ ان خطرات کا اندازہ نہ کر سکیں جو ایسی کسی تجویز میں لازماً مضمر ہیں ——— ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بس "صوبائی خود اختیاری" کے حصول کی خواہش ہے اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور یہ ہمارے نزدیک ان کا ایسا حق ہے جس سے کسی بھی معقول انسان کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا اور مرکزی حکومت کے مؤثر طور پر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو امور ضروری ہیں انہیں مرکز کی تحویل میں دینے کے بعد بقیہ تمام معاملات میں مشرقی پاکستان کو کامل صوبائی خود اختیاری لازماً ملنی چاہیئے۔

انہی متذکرہ بالا دو امور کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر بھی ایک بار حتمی طور پر فیصلہ کر لینے کی شدید ضرورت ہے اور تمام حالات و واقعات کا مردانہ وار مواجہہ کر کے اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لینا لازمی ہے اور اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک کسی مملکت کے انتظام و انصرام میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت دیانت و امانت کو حاصل ہے نہ کہ قواعد و ضوابط اور تدابیر تحدید و توازن (CHECKS AND BALANCES) کے اس بے جان ڈھانچے کو

جسے 'دستور' کہا جاتا ہے تاہم ہمارے یہاں جو خلاء اس میدان میں چلا آرہا ہے اسے ایک بار جرأت و ہمت کے ساتھ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق پُر کر لینا ہی بہتر ہے۔

دستور کے مسئلے پر ہمارے یہاں اس وقت بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ بہت سے لوگ ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی کے خواہاں ہیں۔ اگرچہ وہ ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر رہے ہیں کہ اس میں بنیادی ترمیموں کی ضرورت ہے اور اگرچہ خان قیوم نے ایک علیحدہ آواز بلند کی ہے یعنی یہ کہ فی الحال ایک عبوری دستور نافذ کر دیا جائے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دائیں بازو نے اپنے حلقۂ اثر کی تمام جماعتوں اور شخصیتوں کو اس معاملے میں تقریباً متفق کر لیا ہے (جس کی تازہ ترین مثال شیخ مجیب الرحمٰن کا بھی ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی سے متفق ہو جانا ہے) دوسری طرف ایک مطالبہ یہ ہے کہ بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں آئے اور اسے ایک معیّن مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اندر دستور سازی کا پابند کیا جائے ——— بعد میں یہی اسمبلی پارلیمنٹ کی حیثیت سے کام کر سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے منطق کے ہر اصول کے مطابق اقرب الی الصواب ہے۔ اور اگرچہ ہمیں، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، ۱۹۵۶ء کے دستور سے بھی کوئی کد نہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک حقیقت یہی ہے کہ ہمارے یہاں اب تک کی کسی دستوری دستاویز کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی پشت پر عوام کی رائے اور مرضی موجود ہے۔ اور ان میں سے کسی کو بھی آئندہ انتخاب کی بنیاد بنایا گیا، تو یہ اعتراض جائز طور پر موجود رہے گا کہ ایک غیر نمائندہ دستور کے تحت منعقد شدہ انتخابات کے نتائج بھی قابلِ اعتماد نہیں قرار دیئے جا سکتے ——— ——— ہمارے نزدیک صدر مملکت محمد یحییٰ خاں کی وہ رائے نہایت صحیح ہے جو انہوں نے خان قیوم خاں کی متذکرہ بالا تجویز کے جواب میں ظاہر کی ہے یعنی یہ کہ موجودہ مارشل لاء خود ایک 'عبوری دستور' کی ضرورت پوری کر رہا ہے ——— اب اس معاملے میں جو اقدام بھی ہو وہ عارضی اور عبوری اور پیشگی طور پر واجب الترمیم نوعیت کا نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لیا جائے ——— اور ظاہر ہے کہ اس کی کوئی صورت اس مؤخر الذکر تجویز کے سوا ممکن نہیں۔

دوسری بڑی پیچیدگی جو پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اور روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے

یہ ہے کہ اپنے اوّل یوم پیدائش ہی سے پاکستان کو ایک ایسی مملکت کی عداوت و دشمنی کا سامنا ہے جو ایک طرف تو نہ صرف یہ کہ اس کے بالکل قریبی ہمسائے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ پاکستان کے دونوں خطوں کے مابین حائل ہونے کی بنا پر گویا پاکستان کے چھوٹے سے جسم میں ایک بہت بڑے خنجر کی طرح پیوست ہے اور دوسری طرف اپنی وسعت، قوّت، آبادی اور وسائل تمام اعتبارات سے پاکستان سے کم از کم چوگنی ہے[1]

> بھارت کی یہ مستقل عداوت نہ صرف یہ کہ ہمارے محدود وسائل و ذرائع پر ایک بہت بڑے بوجھ کا سبب بنی رہی ہے جس کی بنا پر اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیر و ترقی کے جملہ امکانات بروئے کار نہ آسکے ——— بلکہ بدقسمتی سے اسی ایک مرکز کے گرد ہماری پوری خارجہ حکمت عملی کو ہمیشہ گھومنا پڑا ہے۔

اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گذشتہ بائیس سالوں کے دوران دو دور گذر چکے ہیں۔ اور اب تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے ——— پہلا دور آرام و آسائش بلکہ عیش اور گلچھروں کا دور تھا۔ اب دوسرے میں ہمیں نسبتاً مشکل تر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اب جو دور شروع ہو رہا ہے آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ہمیں اپنی آزادی اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت شدید جد و جہد اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا ہوگا۔

پہلے دور میں دنیا کی بڑی طاقتیں دو دھڑوں میں منقسم تھیں۔ ایک طرف روس اور چین پر مشتمل کمیونسٹ بلاک تھا اور دوسری طرف انگلو امریکی اتحاد اور ان کے مابین شدید کش مکش اور مسلسل جنگ جاری تھی جو کبھی گرم ہو جاتی کبھی سرد۔ بھارت نے ایک نئی طاقت کی حیثیت سے ان کے مابین

---

[1] اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بھارت اور اسرائیل میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں دنیا کے نقشہ پر اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل خنجروں سے مشابہ ہیں۔ ایک بلادِ عرب کے سینے میں پیوست ہے اور دوسرا اسلامیانِ پاکستان کے جسد میں ——— بلادِ عرب اگر وسعت میں زیادہ ہیں تو اسلامیانِ پاکستان تعداد میں مسلمانانِ عرب کی مجموعی تعداد سے بھی کہیں زیادہ ہیں اور اسرائیل بھارت کے مقابلے میں چاہے بہت چھوٹا ہے لیکن مغربی استعمار کی پشت پناہی کی بنا پر بھارت سے کسی طرح بھی کمزور نہیں!!

'ثالثی' کا کردار اختیار کرنے کی کوشش کی اور اپنی نام نہاد آزاد اور غیر جانب دار خارجہ پالیسی کے نام پر خصوصاً مغربی بلاک کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اس صورت حال کا عروج تھا وہ وقت جب ہندوستان میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے لگ رہے تھے! اس وقت مغربی بلاک کو شدید ضرورت تھی کہ اس علاقے میں کوئی ملک ایسا ہو جہاں اس کے قدم بھی کسی قدر جم سکیں۔ ان کی اس ضرورت کو اپنی خارجہ حکمت عملی میں فٹ پاکر پاکستان نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ یہ وہ دور تھا جب ہم پر چچا سام نہایت مہربان تھے اور ہمارے ہر طرح کے ناز نخرے برداشت کرنے کو تیار تھے ——! اور دوسری طرف ہم بھی ان کے کامل نیاز مند تھے اور ان کے اشارے پر کبھی سیٹو میں حاضری دیتے تھے کبھی سنٹو میں ——!!

اس کے بعد حالات بدلے۔ ایک طرف چین اور روس کے مابین اختلافات کی خلیج نمودار ہوئی دوسری طرف روس کا رویہ مغربی اتحاد کے ساتھ بدلنا شروع ہوا، تیسری طرف بھارت کو 'عقل' آئی اور اس نے اندر ہی اندر چچا سام سے تعلقات استوار کر لئے —— اور چوتھی طرف روس، مغربی اتحاد اور بھارت تینوں نے چین کو اپنے مشترک دشمن کی حیثیت دینی شروع کر دی —— نتیجۃً بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملی کے میدان میں ہم نے جس زمین پر تعمیر کی تھی وہ پیروں تلے سے کھسکنی شروع ہو گئی —— اور بھارت کو امریکہ اور روس دونوں کے منظور نظر کی حیثیت حاصل ہو گئی —— یہ ہمارے لئے مشکلات کے دور کا آغاز تھا۔ اس دور کے بالکل ابتدا میں ایک کوشش امریکہ نے یہ کی بھی کہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کے مابین ایسی مکمل 'مفاہمت' کرا دی جائے کہ یہ دونوں سوکنوں کی بجائے بہنوں کی صورت اختیار کریں اور دونوں ہمارے اشاروں پر یکساں حرکت کر سکیں۔ اسی غرض سے اس نے پنجاب کے دریاؤں کے پانی کے مسئلے کو جیسے تیسے حل کرانے کا کھکھیڑ مول لیا اور بعض دوسرے معاملات میں بھی صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کا عروج (Climax) تھی وہ تجویز جو امریکہ نے سابق صدر ایوب کے ذریعے پیش کرائی کہ پاکستان اور ہندوستان کا دفاع مشترک ہو جائے —— اس تجویز پر پنڈت نہرو کے احمقانہ ردعمل سے اس معاملے میں (Anti-climax) کے دور کا آغاز ہوا۔ اور پاکستان میں آزاد خارجہ حکمت عملی کا دور شروع ہو گیا۔

اب ظاہر ہے کہ کسی کے گھڑے کی مچھلی بنے رہنے میں جو آسانی اور عافیت ہے وہ اپنی آزاد رائے اور آزادانہ حیثیت و تشخص کو برقرار رکھنے اور دوسروں سے منوانے (یعنی Assert کرنے)

میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ آزادی بہر حال جد و جہد اور محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا مطالبہ کرتی ہے ـــــ چنانچہ اس دور میں ہمیں لامحالہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔

اور اب جس تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ وہ اسی صورتِ حال کی گویا ایک منطقی انتہا کا دور ہے۔ اس وقت جن حالات سے ہم دوچار ہیں وہ یہ ہیں: کہ ایک طرف صاحب برطانیہ بہادر تو بالکل ہی اپنی بساط مشرق سے لپیٹ گئے ہیں۔ خود چچا سام بھی پہلے کوریا اور پھر ویٹ نام میں اس قدر مار کھا چکے ہیں کہ اب اس علاقے سے کسی قدر باعزت طور پر کھسک جانے ہی میں عافیت محسوس کر رہے ہیں۔ دوسری طرف روس نے امریکہ کی خاموش رضا کے تحت اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی پاؤں پسارنے شروع کر دیئے ہیں اور تیسرے جنوب مشرقی ایشیا میں ان دونوں کا اصل اتحادی بھارت اور اصل دشمن چین بن چکا ہے ـــــ اور اب امریکہ، روس اور بھارت تینوں مل کر زور لگا رہے ہیں کہ ہم ان کے تابع مہمل بن کر ان کی مرضی کے مطابق چین کی مخالفت میں ان کا پسندیدہ کردار ادا کریں اور اس علاقے میں بھارت کے مقابلے میں گھٹیا درجے کی شہریت (Second rate citizenship) قبول کر لیں ـــــ اس طرح یہ دور ہماری قومی غیرت اور حمیت کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج بن کر شروع ہو رہا ہے اور اس کے لئے ہم پر ہر ممکن دباؤ کو استعمال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف بھارت نے ایران اور عرب ممالک میں اپنے تجارتی و صنعتی اثر و رسوخ کے جال کو تیزی کے ساتھ بچھانا شروع کر دیا ہے اور یہ امر ہمیں ہوشیار کرنے کے لئے کافی ہونا چاہئے کہ ان ممالک کی جانب سے بھارت کے ان عزائم کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ دوسری طرف بھارت نے افغانستان سے اپنے پرانے معاشقے کی ازسرِ نو تازہ جوش و خروش کے ساتھ تجدید کرنی شروع کر دی ہے اور ایک فراخ بند سے جو خطرہ مشرقی پاکستان کی زرعی معیشت کو تھا۔ اس کا حل بھی ابھی نہیں ہوا تھا کہ افغانستان سے آنے والے دریاؤں کو خشک کر کے مغربی پاکستان کی معیشت پر خطرناک وار کرنے کی سکیم پر سوچ بچار شروع ہو گیا ہے۔ تیسری طرف خاص اس موقع پر سرحدی گاندھی سے اندرا گاندھی کی ملاقات، انہیں نہرو پرائز وصول کرنے کے لئے بھارت آنے کی دعوت اور ان کی خدمت میں اسّی لاکھ روپے کی رقم بطور نذرانہ پیش کرنے کی سکیم سے بھارت کے عزائم واضح طور پر سامنے آ رہے ہیں ـــــ اور بھارت کی ان ساری کوششوں اور تدبیروں پر مستزاد ہیں روس کی تجاویز جو کبھی کوسیجن صاحب کے پیش کردہ معاشی تعاون کے منصوبے کی صورت میں سامنے آتی ہیں اور کبھی برزنیف صاحب کی پیش کردہ 'اجتماعی سلامتی' کی سکیم کی شکل اختیار کرتی ہیں ـــــ اور ان سب پر مستزاد

ہے چچا سام کی منظوری و رضامندی کی مہر جو ایسی تمام تجاویز پر خاموشی یا "محتاط ردعمل" کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ صورتِ حال ہر غیور اور باحمیت پاکستانی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ کمر ہمت کس کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ اس مشکل کے وقت میں ہماری اصل قوت مدافعت و مزاحمت ایک آزاد اور باعزت و باوقار ملک و ملت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے ایک شدید داعیے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ داعیہ محض "زندگی برائے زندگی" کے نظریئے سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نظریئے کے تحت تو انسان بسا اوقات ذلت اور بے عزتی کی حالت کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ یہ داعیہ کسی مقصدِ زندگی سے آشنا ہو کر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے اندر اگر کسی مقصد کا عشق پیدا ہو جائے اور یہ انسانیت کے لئے کسی نظریئے اور پیغام کی علمبردار بن کر اٹھ سکے تبھی اس میں وہ ہمت، وہ جرأت، وہ ایثار، وہ قربانی، اور محنت و مشقت کا وہ جذبہ بیدار ہو سکتا ہے جو ان حالات میں اس کے بقا و تحفظ ہی نہیں ترقی و استحکام اور عزت و وجاہت کا ضامن بھی بن سکتا ہے ——

اب ظاہر ہے کہ یہ نظریہ وہی ہو سکتا ہے جس کے نام پر پاکستان قائم ہوا تھا اور وہ پیغام اسلام کے پیغام کے سوا اور کوئی نہیں —— گویا جس طرح پہلی پیچیدگی کا اصل اور مستقل حل دینی جذبات اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے میں ہے، اسی طرح اس دوسری پیچیدگی اور اشکال کا اصل حل اور اس سے پیدا شدہ چیلنج کا اصل جواب بھی یہی ہے کہ ہم بحیثیت قوم ایمان کے داعی اور اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور اس مقصد کے لئے ایک ایسا والہانہ عشق ہمارے اندر پیدا ہو جائے کہ اس کے لئے بڑی سے بڑی محنت اور کٹھن سے کٹھن مشقت ہمیں آسان معلوم ہونے لگے اور بڑے سے بڑا ایثار اور اونچی سے اونچی قربانی حقیر محسوس ہو —— !!

اس پیچیدہ صورت حال کا ایک ضمنی تقاضہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہماری خارجہ حکمت عملی کو اب دورِ ثانی کے مقابلے میں بھی زیادہ 'آزاد' ہونا چاہیئے اور اندریں حالات ہمیں عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ اپنے تعلقات پر پہلے سے بھی زیادہ زور دینا چاہیئے۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ اس موقع پر ایک طرف 'دائیں بازو' کی چوٹی کی قیادت (Top brass) نے بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں چین کی مخالفت میں بڑی طاقتوں (Super Powers) کا آلۂ کار ہرگز نہیں بننا چاہیئے اور دوسری طرف وزیر اعظم روس کے دہلی سے واپسی پر 'سر راہے' ورود پاکستان اور اب صدر امریکہ کی خلائی جہاز کی واپسی کے منظر کو دیکھنے کے بعد ٹہلتے ٹہلاتے پاکستان کو

بھی نوادتے جانے کے پروگرام سے یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم چو این لائی کو بھی جلد پاکستان آنا چاہیئے (جس کا سب سے بڑا مظہر آج ۵ جولائی کے اخبارات میں شائع شدہ صدر مملکت محمد یحییٰ خان کا یہ بیان ہے کہ چو این لائی عنقریب پاکستان کا دورہ کریں گے۔

نہ صرف یہ، بلکہ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کو روس، امریکہ اور بھارت کے اتحاد ثلاثہ کے احمقانہ دباؤ کے تحت کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ چین کی جانب جھکنا ہوگا اور یہ حالات کا ایسا بہاؤ ہوگا جس کے رُخ کو روکنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں رہے گا ـــــ!!

oooooooooo

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف **وحدتِ اُمت** میں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ

کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تُلنے کی مستحق ہوتی

وقت کے اہم ترین موضوع پر اِس بہترین اور مفید ترین کتاب کو

اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شان طور پر شائع کیا ہے۔

بڑے سائز کے ۲۵ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ: ۴ روپے ○ علاوہ محصول ڈاک

(۲)

"حیراں ہوں دل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں!"

"تذکرہ وتبصرہ" میثاق ستمبر اکتوبر ۱۹۶۹ء

سال رواں کے اس ربع ... کے دوران میں جو واقعات عالم اسلامی میں رونما ہوئے اور جن حوادث کا سامنا امت مسلمہ کو رہا ان کی یاد سے کلیجہ شق ہوتا ہے، اتنے گوناگوں مصائب اور ایسے پے بہ پے حوادث کہ انسان حیران و پریشان ہو کر رہ جائے کہ ع

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!"

ایک طرف مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کیا گیا اور عالم اسلامی کے روحانی مراکز میں سے قبلہ اعظم ترین مرکز، حرم ثالث، اور ان تین مقدس ترین مقامات میں سے ثالث ثلثہ جن کی زیارت کی نیت سے شد رحال کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے ——— آگ کے شعلوں میں لپٹ کر پورے عالم اسلام کے لئے مجسم دعوت آہ و فغاں بن گیا ؎

"رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونبار یہ
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار!!"

پورا عالم اسلام بے قرار ہو گیا، قلوب مضطرب ہو گئے، روحیں بے چین ہو گئیں، غم و اندوہ اور غیظ و غضب کی ایک لہر پوری ملت اسلامی کے جسد میں دوڑ گئی ——— لیکن آخرش "قہر درویش بر جان درویش!" کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ پوری ملت اسلامی بس تلملا کر رہ گئی۔ اس لئے کہ: ع

"ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!"

جس طرح لمبا اوقات کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے ہی میں عافیت دیکھتا ہے اسی طرح جی چاہتا ہے کہ اس صورت حال کے عواقب سے بھی آنکھیں بند کر لی جائیں اور قطعاً نہ سوچا جائے کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا!! ——— بصورت دیگر سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے، اعصاب جواب دینے لگتے ہیں اور بینائیں چھوٹی محسوس ہوتی ہیں ——— دشمن ہمیں ٹٹول رہا ہے اور رفتہ رفتہ ہماری کمزوریوں سے آگاہ ہوتا چلا جا رہا ہے، صورت حال یک دم تبدیل ہو گئی ہے ——— اور دفعتہً عالم ارضی کی پوری نام

نہاد ملّتِ اسلامی کا بھرم کھل گیا ہے ــــــــــ ابھی تک معاملہ صرف فلسطینی عربوں کے حقوق کا تھا، جسے خود عربوں نے سخت نا عاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنا ایک داخلی سا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ لیکن اب معاملہ پوری ملّتِ اسلامیہ کی دینی غیرت و حمیّت کا ہے۔ اس ذلت کو اگر یہ پوری اُمت اس طرح گوارا کر گئی تو دشمن حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم کی حرمت پر وار کرنے سے کب باز رہے گا! ــــــــ آج کے دور میں جبکہ لاکھوں میل کے فاصلے کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی، اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے مسجد نبوی کا فاصلہ کل چھ سو میل ــــــ اور مسجد حرام کا فاصلہ قریباً آٹھ سو میل رہ گیا ہے ــــــ اور کم از کم حرم نبوی پر اپنے دعویٔ استحقاق کو تو اسرائیل نے کبھی مخفی بھی نہیں رکھا! ــــــــ ادھر قرآن حکیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان اُمتوں کو ان کی بدعملی و بدکرداری کی سزا، ان کے مقامات مقدسہ کی اغیار کے ہاتھوں بے حرمتی کی صورت میں بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کی اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو یہ سزا دو بار دی گئی :-

"فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءُا	پھر جب آیا دوسری وعید کا وقت (تو مسلط کیا
وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ	تم پر لوگوں کو) تاکہ بگاڑ دیں وہ تمہارا حلیہ
كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا	اور داخل ہوں مسجد میں اسی طرح جس طرح داخل
مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ٥"	ہوئے تھے اس میں پہلی بار اور تباہ کر دیں ہر چیز
(سورہ بنی اسرائیل، آیت ۷)	کو جس پر بھی بس چل جائے!"

تو کیا اب ہماری سیہ کاریوں کی کالک حرمین شریفین کی مقدس پیشانیوں پر بھی مل جائے گی!! ــــــ عیاذاً باللہ! عیاذاً باللہ!!

دوسری طرف بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی ــــــ اور تاحال یہ شغل جاری ہے!! یوں تو ہندی مسلمانوں پر ظلم و تشدد اور تعدّی و عدوان بھارت کی ہندو جاتی کا روز کا معمول ہے۔ لیکن احمد آباد اور اس کے گرد و نواح میں تو ان دنوں بالکل ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستان دہرائی گئی اور بعینہٖ وہی نقشہ سامنے آگیا کہ ع : ــــــ "ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو!"

اللہ کی شان ہے کہ جو شہر خود احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نام نامی سے معنون ہو، اُس میں اُن ہی کے دین کے نام لیوا اس طرح بھیڑ بکریوں کے مانند ذبح ہو رہے ہیں اور پورا عالم اسلام ہے کہ "تکتک دیدم دم نہ کشیدم!" کا نقشہ پیش کر رہا ہے ــــــــ درآنحالیکہ کتاب الٰہی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ :

"وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ　　اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝"

(سورہ نساء : آیت ۷۵)

اللہ کی راہ میں اور ان مغلوب و مقہور مردوں، عورتوں اور بچوں (کی داد رسی) کے لئے جو کہتے ہیں کہ: "اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی جانب سے کوئی حامی اور مددگار اٹھا!"

اس معاملے میں یوں تو اس عالم ارضی کی پوری امت مسلمہ کی ملی غیرت و حمیت کا مرثیہ کہنا چاہیئے ——— خصوصاً اس لئے کہ یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی ملت اسلامی نے ہمیشہ پورے عالم اسلامی کے رنج و غم کو اپنا دکھ درد شمار کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ صورت حال یہ رہی کہ چاہے کبھی بلقان و ترکی پر بُرا وقت آیا ہو، چاہے طرابلس و شام پر ہندوستانی مسلمان بالکل اس طرح تڑپ اٹھتا رہا جیسے خود اس کے پہلو میں خنجر بھونکا گیا ہو ؎

"خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر!
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!!"

لیکن اُدھر یہ عالم ہے کہ بھارت میں "فی کُلِّ عامٍ مَرَّۃً اَوْ مَرَّتَیْنِ" مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے لیکن عالم اسلام ——— اور بات کہنے کی نہیں لیکن ع "خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!" کے مصداق کہنی پڑتی ہے کہ خصوصاً عالم عرب کا حال یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت بھارت کی نیاز مندی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے ایک دوسرے سے زیادہ بے تاب نظر آتی ہے ——— ماضی میں پنڈت نہرو کو عین مملکت عربیہ سعودیہ میں حرمین شریفین کی خادم و محافظ حکومت نے "رسول السّلام" کے خطاب سے نوازا ——— اور اس موقع پر تو حد ہو گئی کہ عین اس وقت جبکہ بھارت کے ایک صوبائی دارالحکومت میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور گھاس پھونس کی طرح جلایا جا رہا تھا۔ زمامِ عرب، رباط کی مسلم سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت پر زور دے رہے تھے اور اس معاملے میں ان کی صفوں میں ایک غیر معمولی اتحاد و اتفاق نظر آ رہا تھا حتیٰ کہ اس حمام میں "رجعت پسند شاہ پرست" اور نام نہاد "ترقی پسند" سب یکساں ننگے تھے ؎

"ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!"

عالم اسلام اور خصوصاً عالم عرب سے یہ گلہ شکوہ قدرے دور کی بات سہی، لیکن ملت اسلامیہ پاکستان

کے لئے تو یہ "واقعتاً" ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ جن کی قربانیوں کے طفیل آج نہ صرف یہ کہ آزادی کے سانس لے رہی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گلچھرے اڑا رہی ہے ان پہ مظالم کے پہاڑ "ٹوٹتے" دیکھ کر بھی یہ ٹس سے مس نہیں ہوتی ——— خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور مکافات عمل صرف عالم آخرت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اقوام و ملل کے اجتماعی جرائم کا حساب تو اکثر و بیشتر یہیں چکا دیا جاتا ہے ——— ہمارے لچھن اگر وہی رہے کہ جو اب ہیں اور ہم اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے خون کی سرخی کو شراب ارغوانی اور غازۂ چہرۂ نسوانی میں تبدیل کرتے رہے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا ———!!

کم از کم ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم ہندی مسلمانوں پر ظلم و ستم کی اس پیہم یلغار کو اسی طرح خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے اور ہماری رگ حمیت صرف اسی قدر جوش کھاتی رہی کہ ہر بار ظالموں کی اس منڈلی کی دہائی دی جاتی رہی جسے اقوام متحدہ کہا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ ہماری حمیت قومی اور غیرت ملی کا جنازہ بالکل نکل جائے گا اور وہ وقت زیادہ دور نہیں جب صورت وہ ہو جائے گی کہ ع :

"کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!"

پھر تاریخ کی یہ شہادت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس گھرانے سے غیرت رخصت ہو جائے اس سے آزادی اور خود اختیاری کو بھی روانہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ! اللہ تو ہمیں اس انجام بد سے بچائے ! آمین۔

اندرون ملک کے حالات کو دیکھئے تو مزید مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے اور ع :

" تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم ! "

کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اوپر کا سارا گلہ شکوہ ہی بے بنیاد نظر آنے لگتا ہے اس لئے کہ یہ سارا "انتفاضہ" تو صرف "ملت اسلامیہ" کے نام مناسب ہو سکتا ہے اور یہاں یہ تصور ہی کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم کے درجے کو پہنچ چکا ہے ع :

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!"

چنانچہ جس قسم کے نعرے آج سے پچیس تیس سال قبل عالم عرب میں لگے تھے یعنی "المصر للمصریین" (مصر مصریوں کا ہے !) اسی قسم کے نعرے آج سرزمین پاک میں بلند ہو رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں تو بنگالی قومیت کا راگ شروع ہی سے الاپا جا رہا تھا اب سندھ بھی "جئے سندھ" کے نعروں سے گونج رہا ہے اور یہی حال بلوچستان اور سابق صوبہ سرحد کا ہے" ——— رہا پختونستان کا سٹنٹ تو قدیم تھا ہی، ایک نئی دو عملی یہ ایجاد ہوئی ہے کہ "عظیم باپ" افغانستان میں بیٹھا آزاد پختونستان کے نعرے کو ہوا دے رہا ہے اور اس کی صلبی و معنوی ذریت پاکستان میں بیٹھ کر اس کی ایک

نسبتاً کم قابلِ اعتراض تعبیر پیش کر رہی ہے ـــــــ الغرض وہ نعرہ کہ ؎

"بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
کہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی!!"

جو تحریکِ پاکستان کے دوران خوب زور شور سے بلند ہوا تھا، ایران و افغانستان تک کیا پہنچتا خود پاکستان میں دم توڑ رہا ہے[1] پوری ارضِ پاک میں ایک خطۂ پنجاب ہے جو شاید اپنے اس مایہ ناز سپوت کی لاج رکھنے کو جسے دنیا علامہ اقبال کے نام سے جانتی ہے "رجوع الی الجاہلیت" کی اس وبا سے قدرے بچا ہوا ہے ـــــ لیکن تابہ کے! ـــــ اگر یہ ایک واقعی قانونِ فطرت ہے کہ "ہر عمل ایک ردِّ عمل کو جنم دیتا ہے!" تو جلد یا بدیر یہاں بھی وہی صورت پیدا ہو کر رہے گی ـــــ!

اس صورتِ حال میں ہندی مسلمانوں کی داد رسی کی توقع کس سے ہو؟ ـــــ یہاں تو بنگالی مسلمان نے غیر بنگالی مسلمان کا خون بہانے سے دریغ نہ کیا۔ کوئٹے میں بار بار فسادات کی آگ بھڑکی اور سندھ کے متعدد شہروں میں غیر سندھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا باقاعدہ پروگرام بن چکا تھا ـــــ یہ تو بھلا ہو مارشل لاء کا کہ بروقت نافذ ہو گیا ورنہ مغربی پاکستان بھی اس میدان میں مشرقی پاکستان کی ہمسری کا شرف حاصل کر لیتا۔

تشتّت و انتشار کی اس گرم بازاری میں مزید اضافہ دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کی ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے ہو گیا ہے، چنانچہ دونوں کیمپوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور بیزاری بڑھتی جا رہی ہے اور اشتعال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے حتیٰ کہ تشدّد اور تصادم اور فیصلہ کن مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور نوجوان ایک

---

[1] ہم نے جولائی کے شمارے میں پاکستان کی اجتماعی زندگی کی جن الجھنوں اور پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا تھا ان میں سے تیسری الجھن جو مضمون کی دوسری قسط میں بیان ہوئی تھی یہی ہے کہ پاکستان میں 'قومیت' کا ایک ہولناک خلا ہے جو کوئی آج پیدا نہیں ہوا بلکہ بالکل ابتدا سے چلا آ رہا ہے لیکن بعد میں ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے اس لئے احتراز کیا کہ : ع "اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں!" سردست صرف اس اشارے پر اکتفا مناسب ہے کہ پاکستان قائم تو "ملت از وطن است!" کی پُر زور نفی اور 'ملتِ اسلامی' کے تصور کے زور دار اثبات پر ہوا تھا۔ لیکن خود اس کے قائم کرنے والے نے پہلے ہی روز غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ کر کہ : "پاکستان میں نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان، مذہبی اعتبار سے نہیں اس لئے کہ وہ تو ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے ... !" ملتِ اسلامی کے تصور کی نفی اور 'وطنی قومیت' کا اثبات کر دیا تھا (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

دوسرے پر پل پڑنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔

رہی سہی کسر علمائے دیو بند کے دو متحارب گروہوں نے ایک دوسرے کے مقابل آکر پوری کر دی ہے۔ ان کے مابین بغض حادثہ نہیں قدیم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک ان کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کے مظاہرے دیکھنے میں آتے تھے لیکن معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ، "تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى" والا معاملہ تھا، چنانچہ جونہی دوبارہ اختلاف رونما ہوا فضا ایک دم شرعی گالیوں سے معمور ہوگئی ——— بنائے نزاع "سوشلزم" کو قرار دیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ سرمایہ داری کے دونوں ہی گروہ یکساں مخالف ہیں۔ اور مزدوروں اور کسانوں کی 'حالت زار' کا دونوں ہی کو برابر رنج و غم ہے۔ حتیٰ کہ معاشی عدل و اعتدال کے لئے فوری تدابیر میں بھی دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ——— بایں ہمہ کفر کے فتوے عام ہو رہے ہیں اور "کانگرسی مولوی" کی گالی میں تو خیر کوئی مضائقہ ہی نہیں ع

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

عجیب طرفہ تماشا ہے کہ "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح تو سر آنکھوں پر لیکن "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح قطعاً ناجائز و حرام ——— پھر مزید یہ کہ جس شخص نے سب سے پہلے یہ اصطلاح استعمال

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) چنانچہ اسی وقت سے ہمارے یہاں ملتِ اسلامی اور پاکستانی قومیت کے مابین ایک کھیل جاری ہے۔ اور یہ اسی کھیل کے ثمرات ہیں جو آج علاقائی و لسانی قومیتوں کے فروغ کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ نظریۂ ملت کو خود ہم نے منہدم کر دیا اور پاکستانی قومیت کا تصور ہمارے مزاج کے مناسب نہ تھا۔ چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی میں وہ خلا پیدا ہوا جو رفتہ رفتہ مذکورہ بالا قومیتوں اور عصبیتوں سے پُر ہوا ——— چنانچہ اب شکایت ہو تو کس سے اور گلہ ہو تو کس کا!؟ ——— ع "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست !!"

اگرچہ یہ اندیشہ بھی شدید ہے کہ بات کہیں 'حدود' سے تجاوز نہ کر جائے، لیکن دردِ دل بالکل خاموش بھی نہیں رہنے دیتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے 'جینیئہ' الفاظ پر تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آج تک بھی ان کا قصور معاف نہیں ہوا حالانکہ جب انہوں نے اپنے بیان کی وضاحت فرمائی تو علامہ اقبال نے بھی اپنے اشعار سے رجوع کر لیا تھا۔ لیکن بانیٔ پاکستان کے اس نظریۂ وطنیت پر تنقید کی جرأت کسی کو نہ ہوئی حتیٰ کہ علما بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے ؎

دیکھ کعبے میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ !
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ !!

کی یعنی محمد علی جناح مرحوم وہ تو سب کے نزدیک قائد اعظم اور رحمۃ اللہ علیہ لیکن اب جو بھی یہ لفظ منہ سے نکالے وہ کافر و مرتد۔ بحالیٔ جمہوریت کے لئے تو ہر کس و ناکس سے تعاون کو جائز ہی نہیں لازمی و ناگزیر قرار دیا جاتے اور معاشی ناہمواریوں کو دُور کرنے کی غرض سے کوئی مزدوروں سے اتحاد کرلے تو گردن زدنی ٹھہرے!

" خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!"

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کا انجام کیا ہوگا ــــــ اور ہماری قومی و ملی زندگی کسی حادثے سے دو چار ہوگی۔ بظاہر احوال تو امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی!

ان حالات میں جس کسی سے جو کچھ بن آئے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ فساد اتنا ہمہ گیر ہے کہ کسی بھی تدبیر کے صدفی صد کارگر ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ایک ہی صورت ممکن ہے کہ نتائج سے بالکل بے پروا ہو کر جس سے جو خدمت دین و مذہب اور ملک و ملت کی بن پڑے اسے کرتے رہنا چاہیئے۔

ہمیں اللہ تعالےٰ نے اپنی حقیر سی مساعی کو خدمت قرآن کے لئے وقف کرنے کے فیصلے کی توفیق دی ہے۔ چنانچہ جیسے بھی بن آرہا ہے ہم اپنی صلاحیتوں اور اوقات کی حقیر سی پونجی اسی کام میں صرف کئے جا رہے ہیں۔ ہم اس توفیق پہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اسی سے اخلاص کی بھیک مانگتے ہیں تا ہمارا یہ عمل اس کی بارگاہ میں قبول ہو۔

ڈاکٹر اسرار احمد
نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں
ایک اصلاحی تحریک
بھی برپا کی اور ــــ خطبۂ نکاح ــــ کو صرف ایک رسم
کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا
اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔
بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور ،
ہدیہ: ۱۲ روپے ـــــ محصول ڈاک علاوہ

(۳)

"..... وقتِ دعا ہے!"

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق دسمبر ۱۹۷۱ء

ان سطور کی تحریر کے وقت مشرقی پاکستان پر بھارت کا باقاعدہ حملہ شروع ہوئے بیس روز ہو چکے ہیں اور مغربی پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ شروع ہوئے بھی آٹھ دن ہو چکے ہیں ۔ اور اس وقت دونوں محاذوں پہ میدانی جنگ بھی نہایت گھمسان کی ہو رہی ہے اور دونوں ملکوں کی بحری و فضائی قوتوں میں بھی خوفناک ٹکراؤ جاری ہے ——— ادھر اقوامِ متحدہ میں بھی گفت و شنید کا سلسلہ چل رہا ہے اور دنیا بھر کے تمام اہم دارالسلطنتوں کی توجہات بھی برّصغیر پر مرتکز ہیں ۔

کل کیا ہوگا وہ " وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا [1] " کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی " وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا [2] " کے مصداق کسی کے علم میں نہیں ! — حتیٰ کہ یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ جنگ کے خاتمے سے قبل یہ سطور بھی طبع ہو کر قارئین تک پہنچ پاتی ہیں یا نہیں !

تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان کے وجود اور بقا کے لیے یہ جنگ فیصلہ کن ہے اور ہر پاکستانی مسلمان کے لیے یہ وقت جان کی بازی کھیل جانے کا ہے ، اور ساتھ ہی چونکہ پاکستان کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہی تھا اور اس کا اب تک قائم رہنا بھی اسی کے رحم و کرم کا نتیجہ ہے لہٰذا ہر پاکستانی کو بارگاہِ خداوندی میں صدقِ دل سے دعا بھی کرنی چاہیئے ۔

لیکن یہ واضح رہنا چاہیئے کہ دعا بس کچھ رٹے ہوئے الفاظ کے زبانوں سے ادا کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ ہر وہ شخص جو خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ خود اس نے اپنے پروردگار سے کوئی وفادارانہ رشتہ بھی استوار کیا یا نہیں ؟

---

[1] " اور نہیں جانتا کوئی ذی نفس کہ وہ کل کو کیا کمائے گا ۔" سورہ لقمان آیت ۳۴

[2] : " اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کی شامت آگئی ہے یا ان کا رب ان پر کرم فرمائی کا ارادہ رکھتا ہے ۔" سورہ جن آیت ۱۰

اور خود اس نے اس کے دین کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ کیا یا نہیں؟ - اس لئے کہ خدا کا تو واضح فرمان یہ ہے کہ " اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ[1]"

واقعہ یہ ہے کہ ہم نے پاکستان ایسی نعمتِ غیر مترقبہ اور وہ بھی خداداد کی نہ کوئی قدر کی اور نہ ہی اس کا کوئی حق ادا کیا اور ہم بحیثیت قوم عدالتِ خداوندی میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور اب بھی کوئی آثار ایسے موجود نہیں کہ یہ امید کی جا سکے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا دھارا دین کی طرف مڑ سکے گا۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرد اس پوزیشن میں نہیں کہ پوری قوم کی جانب سے بارگاہِ خداوندی میں " اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ[2] کا توبہ نامہ پیش کر کے " اَنْ تُهْلِكَنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا[3] کی استفہامی درخواست اور دعا پیش کر سکے ؛ ——— ہاں ایک بات ممکن ہے اور وہ یہ کہ :

ہر وہ شخص جو واقعتاً صدقِ دل سے خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہتا ہو پہلے بارگاہِ خداوندی میں اپنے تمام گناہوں پر صدقِ دل سے اظہارِ ندامت بھی کرے اور عزمِ توبہ بھی! اور پھر یہ عہد کرے کہ کم از کم اس کی اپنی زندگی اور اسکے میسّر اوقات اس کی دین کی نصرت کیلئے وقف رہیں گے اور اسکی قوتوں، صلاحیتوں اور توانائیوں کا بہتر اور اکثر حصّہ اللہ کی ہدایت کی نشر و اشاعت اور اس کے دین کے غلبے کے مقصد میں صرف ہو گا اور وہ پاکستان میں ایک صحیح معنی میں اسلامی معاشرہ اور حقیقی معنوں میں اسلامی ریاست کے قیام کو اپنی زندگی کا اصل نصب العین بنائے رکھے گا ؛

تب اگر وہ اللہ تعالےٰ سے پاکستان کی سلامتی کی دعا کرے گا تو وہ یقیناً مقبول ہو گی - راقم خود اسی عزم اور ارادے کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں پاکستان کی فتح کی درخواست پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی جاننا چاہتا ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اس عزم اور ارادے میں اس کے ساتھ ہیں ——— رَبَّنَا اِنَّا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ - اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ - اٰمِيْن يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْن !!

---

[1] " اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا " سورہ محمدؐ آیت ۷

[2] " ہم تیری جانب رجوع کرتے ہیں " ! سورہ اعراف: آیت ۱۵۶

[3] " کیا تو ہمیں ہمارے ناسمجھ لوگوں کے کرتوتوں کے سبب ہلاک فرما دے گا " سورۂ اعراف آیت ۱۵۵

لائبریری قرآن اکیڈمی کراچی
7A|16|34

(۴)

سقوطِ مشرقی پاکستان

اور ذلت آمیز شکست کے اسباب وعوامل

"تذکرہ وتبصرہ" جنوری، فروری ۱۹۷۲ء

دسمبر ۱۹۷۱ء کا شمارہ پاک ہند جنگ کے دوران شائع ہوا تھا اور اس کے 'تذکرہ وتبصرہ' میں ہم نے "وقتِ دعا ہے ....!" کے عنوان سے عرض کیا تھا کہ

"کل کیا ہوگا وہ — 'وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا'[1] کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی 'وَاَنَّا لَا نَدْرِیْ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا'[2] کے مصداق کسی کے علم میں نہیں ...."

تو اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے تو نہیں تھے جو "فتح لازماً ہماری ہوگی!" اور "ہم عید کی نماز دہلی اور کلکتہ میں پڑھیں گے!" کی قسم کی بڑیں ہانکتے تھے۔ تاہم اس اقرار میں ہمیں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ ایسی ذلت آمیز شکست کا تو ہمیں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ مشرقی پاکستان کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے سبب سے یہ خدشہ تو ہمیں کبھی کبھی ہوتا تھا کہ کہیں مشرقی پاکستان ہماری فوج کا قبرستان نہ بن جائے[3] لیکن یہ کبھی تصور میں بھی نہ آسکتا تھا کہ مشرقی پاکستان عالم ارضی کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کی عزت وناموس کی شمشان بھومی کی صورت اختیار کرے گا اور ایک ایسی فوج کے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور افسر انتہائی ذلت کے ساتھ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے جس کی شجاعت

---

[1] "اور نہیں جانتا کوئی ذی نفس کہ کل وہ کیا کمائے گا" سورۂ لقمان آیت ۳۴

[2] "اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کی شامت آگئی ہے یا ان کا رب ان پر کرم فرمائی کا ارادہ رکھتا ہے" سورہ جن آیت ۱۰

[3] چنانچہ مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے یاد دلایا کہ بالکل انہی الفاظ میں ایک بار راقم نے اس خدشے کا اظہار ان کے سامنے کیا تھا!

کا ڈنکہ صرف عالم اسلام ہی میں نہیں پوری دنیا میں بجتا ہے اور جس کی بہادری کے اپنے ہی نہیں دشمن بھی معترف ہیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے دوران کئی بار ایسا ہوا کہ انہیں دشمنوں کے ہاتھوں عبرتناک شکستیں اٹھانی پڑیں۔ تاریخ کے اوراق میں ایسے کئی مواقع کی داستانیں تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں۔ چنانچہ جب کبھی پڑھنے میں آتا کہ اس طرح کے مواقع پر کئی کئی لاکھ کی تعداد میں یہودی مرد عورتیں اور بچے اسیر بنا لیے جاتے تھے تو حیرت ہوتی تھی کہ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم ابھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہو لیکن اسیری کی ذلّت کو قبول کرے۔ اور جیسا کہ نبوکدنصر کے حملے کے بعد ہوا، بالکل بھیڑ بکریوں اور ڈھور ڈنگروں کی طرح لاکھوں کی تعداد میں ہنکا کر ایک ملک سے دوسرے ملک کو لے جائی جائے ——

افسوس کہ ملّت اسلامیہ پاکستان نے اپنی آنکھوں سے جیتے جی یہ منظر دیکھ لیا کہ اس کے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل جوانوں نے نہ صرف یہ کہ انتہائی ذلّت آمیز طریقے پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے بلکہ انہیں اس حال میں "بنگلہ دیش" سے بھارت منتقل کیا گیا کہ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے ——

انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون

اس حادثۂ فاجعہ پر جو کرب و الم نہ صرف مسلمانان پاکستان بلکہ مسلمانان عالم نے محسوس کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ بیان سے باہر ہے۔ کتنے ہی لوگوں کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش کہ ہماری یہ فوج ایک ایک کر کے کٹ مرتی لیکن ہتھیار نہ ڈالتی۔ ہر شخص اپنے دل میں رنج و غم کا ایک بند طوفان لیے پھرتا ہے اور پوری قوم کے احساسات میں تلخی کا زہر گھل کر رہ گیا ہے۔

کاش کہ اس موقع پر قوم کو کوئی "زبان" میسّر ہوتی جو اس کے احساسات کی ترجمانی کر کے اس کے دل کے بوجھ کو کسی قدر ہلکا کر دیتی۔ قومی اور ملّی سطح پر ہماری تہی دامنی کا عالم یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس ایسی کوئی "زبان" بھی موجود نہیں۔ بغداد کی تباہی پر جو نوحے شیخ سعدیؒ نے کہے تھے ان سے اس وقت نہ معلوم کتنے لوگوں کے دلوں کا بوجھ ہلکا ہوا ہو گا۔ ان کا یہ شعر جو زبان زد خاص و عام ہے ان کے اپنے احساسات کی شدّت کا کس درجہ غمّاز ہے کہ ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین
بر زوال ملکِ مستعصم امیر المومنین

پھر جب دولت ہسپانیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھنی تو بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی!

پھر جب دہلی پر قیامت ٹوٹی تو علامہ اقبال مرحوم ہی کے الفاظ میں " داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر! " یہاں تک کہ اسی صدی میں شمالی افریقہ پر یورپی استعمار کے مظالم پر علامہ شبلی مرحوم نے دردناک مرثیے کہے، اور خود علامہ اقبال نے جزیرۂ صقلیہ (سسلی) پر بایں الفاظ نوحہ کہا کہ ؎

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

لیکن افسوس کہ آج حال یہ ہے کہ روئے ارض کی عظیم ترین مسلمان مملکت پر قیامت گزر گئی پھر بھی کوئی ایسا نالہ کسی جانب سے سننے میں نہیں آیا جو قوم کی آواز قرار پاتا اور جسے سن کر قوم محسوس کرتی کہ کم از کم اس کے جذبات کا اظہار تو ہو گیا ـــــــــــ ان حالات میں بے ساختہ نوک قلم پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ مبارک آتے ہیں جو آپؐ کی زبان مبارک سے غزوہ اُحد کے بعد مدینہ منوّرہ واپس تشریف لانے پر جوشِ گریہ سے نکلے تھے کہ " اَمَّا حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِی لَہٗ ! " ـــــ " ہائے! حمزہؓ کے لیے رونے والیاں بھی نہیں! " بالکل اسی طرح حقیقت یہ ہے کہ آج سقوطِ مشرقی پاکستان کا رونے والا بھی کوئی موجود نہیں۔

یہ رونا رلانا، واقعہ یہ ہے کہ محض رسمی نہیں ہوتا بلکہ اس سے حقیقتاً قوم کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ ورنہ بسا اوقات اِس طرح کے صدمے اندر کی اس بند چوٹ کے مانند جو کسی مریض کو اندر ہی اندر ختم کر دیتی ہے کسی قوم کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ " سقوطِ مشرقی پاکستان " پر قوم کے جذبات کا اظہار نہ ہو سکنے کے باعث اندر ہی اندر کا صدمہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے جذبۂ خود اعتمادی کو گھن کی طرح چاٹ کر رہا ہے اور عوام کی اکثریت نہ صرف یہ کہ اس طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں ہے کہ آیا ہماری کوئی حقیقی بنیاد ہے بھی کہ نہیں؟ اور آئندہ بقیہ ملک بھی قائم رہ سکے گا یا نہیں؟ ۔ بلکہ لوگ یہاں تک سوچنے لگے ہیں کہ کیا واقعی پاکستان کا قیام درست اور صحیح تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پاکستان کا قیام ہی ایک غلطی ہو اور اب تاریخ کے بے رحم ہاتھ اس غلطی کی جبری اصلاح کے درپے ہو چکے ہوں۔

یہ صورت حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جو زلزلے کے کسی جھٹکے کے بعد اعصاب پر طاری ہوتی ہے یعنی یہ کہ انسان ہل کر رہ جاتا ہے اور اسے نہ اپنے نیچے زمین ہی محسوس ہوتی ہے نہ سر پر آسمان۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ فضا میں معلّق ہو۔ پھر یہ حالت زلزلے کے جھٹکے کے بعد فوراً ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دیر تک طاری رہتی ہے، اور انسان بہت دیر تک غیر یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔

اس صورت حال میں اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ رنج و الم اور درد و کرب کے احساسات

کو زبان اظہار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی سے تجزیہ بھی کیا جائے کہ جو کچھ پیش آیا اس کے اسباب کیا تھے۔ حقیقی غلطی کہاں تھی اور کتنی تھی، بلکہ یہ بھی کہ یہ واقعہ جو پیش آیا ہے وہ حقیقت میں ہے کیا؟! اور اس سے ہماری کمزوریاں یا خامیاں ظاہر ہوئی ہیں تو کونسی؟ ——— تاکہ قوم پر بحیثیت مجموعی ناامیدی اور مایوسی کی جو کیفیت طاری ہوگئی ہے وہ ختم ہو اور بے اعتمادی اور غیر یقینی کے بادل جو ملک و ملت کی فضا پر چھاگئے ہیں وہ چھٹ جائیں۔

ہمارے نزدیک "سقوطِ مشرقی پاکستان" ایک حادثہ نہیں بلکہ دو واقعات کا مجموعہ ہے، اور کسی حقیقی تجزیئے کے لیے لازمی ہے کہ ان دونوں پر آغاز ہی سے علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے، ان میں سے ایک ہے مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی اور وہاں ایک نئی خود مختار مملکت کا "بنگلہ دیش" کے نام سے قیام اور دوسرا ہے ——— پاک ہند جنگ میں پاکستان کی ذلت آمیز شکست اور عبرت ناک ہزیمت'۔ ان دونوں حوادث کے جمع ہوجانے اور بیک وقت وقوع پذیر ہونے کو چاہے روایتی طور پر اپنی بدقسمتی پر محمول کر لیا جائے چاہے چند افراد کی نااہلی اور بے تدبیری یا غداری پر، چاہے پوری قوم کی سیاسی بے شعوری اور اجتماعی نابالغی پر، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ ہیں دو بالکل جدا حادثات اور انہیں گڈمڈ کرنا کسی طور پر درست نہیں، اس لیے کہ اس حادثے کی اصل تلخی دوسرے جزو سے متعلق ہے نہ کہ پہلے سے!

جہاں تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا تعلق ہے، اس سے پہلے کہ ہم اس واقعے پر اپنا حالیہ 'تبصرہ' پیش کریں مناسب ہے کہ آج سے ڈھائی سال قبل جولائی ۱۹۶۹ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' میں ہم نے اس مسئلے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اسے دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں[1]

اس قدر طویل اقتباس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی حادثے کے وقوع پذیر ہوجانے کے بعد تو ہر شخص ہی 'پنڈت' بن جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اپنی اس تحریر میں اس "اشکال اور الجھاؤ" کے جس مستقل حل کی طرف اشارہ کیا تھا یعنی یہ کہ "دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبے کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور بامداد بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا" وہ تو نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ البتہ جتنی قابلِ حذر چیزوں کا ذکر ہم نے کیا تھا، شامتِ اعمال سے وہ سب کی سب بدترین صورتوں میں رونما ہو کر رہیں۔ چنانچہ جب یہ کمزور رشتہ کمزور تر ہوتا نظر آیا تو نہ تو "مشرقی پاکستان

---

[1] یہ اقتباس چونکہ اسی شمارے کے ص۶۲ پر آچکا ہے لہٰذا یہاں اسے حذف کر دیا گیا ہے (مرتب)

کے عوام کی آزاد مرضی " کو بروئے کار آنے کا موقع دیا گیا، نہ ان سے سیدھی طرح بات ہی کی گئی، بلکہ اس کے برعکس " جبر و تشدد " کی راہ اختیار کی گئی اور دفعتہً " طاقت و قوت کا سخت ترین استعمال کر لیا گیا۔ نتیجتہً اس کا " ردعمل " بھی " نہایت خوفناک " صورت میں سامنے آیا۔ اور آج ہم اس صورت حال سے دوچار ہیں کہ ایک طرف مغربی پاکستان کے عوام کی گردنیں شدید ترین احساس ذلت و رسوائی سے جھکی ہوئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں مایوسی اور دل شکستگی کے مہیب سائے ڈیرہ ڈالے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ حسین و زرخیز اور سرسبز و شاداب خطہ جسے دنیا ربع صدی تک ' مشرقی پاکستان ' کے نام سے جانتی رہی ہے نہ صرف یہ کہ ہم سے کٹ گیا ہے بلکہ اس وقت دشمن کے قبضے میں ہے اور اس بات کا حقیقی خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ مستقل طور پر " مہابھارت " میں " ضم " اور ہندی قومیت میں " جذب " ہو کر نہ رہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد پاکستان میں جو حالات و واقعات رونما ہوئے وہ ہمارے سابق حکمران ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی و بے تدبیری حتیٰ کہ بدنیتی اور بددیانتی کے شاہکار تو ہیں ہی۔ مجموعی اعتبار سے ہماری پوری قوم کے سیاسی افلاس کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں ہم نے گزشتہ پورے سال کے دوران اس موضوع پر بالکل قلم اس لئے نہیں اٹھایا کہ مارشل لا کی تلوار سر پر لٹکی ہوئی تھی اور زبان و قلم پر سخت پہرے قائم تھے۔ چنانچہ ستمبر اکتوبر ۷۱ء کے ' تذکرہ و تبصرہ ' میں ہم نے عرض بھی کر دیا تھا کہ :

> جہاں تک ملکی حالات کا تعلق ہے ان پر کچھ لکھنے پر ابھی طبیعت بالکل آمادہ نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ بحالات موجودہ " پورا سچ " (Whole Truth) کہنا ممکن نہیں اور جزوی صداقت (HALF TRUTH) کے بارے میں ہماری رائے یہ کہ وہ بسا اوقات جھوٹ اور کذب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا جب تک قلم غیر معمولی حالات کی بنا پر عاید شدہ پابندیوں سے آزاد نہیں ہو جاتا ہم منقار زیر پر رہنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "

ہماری حتمی رائے جو مندرجہ بالا اقتباس کے بین السطور میں بھی موجود ہے، یہ ہے کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کو ابتدا ہی سے ایک ملک متصور کر کے سفر کا آغاز اگرچہ نہایت خلوص کے ساتھ اور (In absolute good faith) " ہوا تھا تاہم حتمی یہ ایک غلطی۔ اس کے برعکس صحیح شکل وہی حتمی جس کے جانب مشہور و معروف ' قرارداد لاہور ' میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ جغرافیائی حقائق کا منہ چڑانے کی بجائے ان کا مناسب لحاظ کیا جاتا اور ان دونوں خطوں کو ابتدا ہی سے دو آزاد اور خود مختار ملک تصور کر کے سفر کا آغاز کیا جاتا۔ اس صورت میں غالب امکان یہی تھا کہ ایک طرف تو یہ دونوں ملک بھارت کی مشترک دشمنی کے زیر اثر آپ سے آپ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ایک دوسرے

کے ساتھ نہایت قریبی تعاون اور اشتراکِ عمل رکھنے پر مجبور ہوتے اور دوسری طرف مشرقی پاکستان میں مقامی ہندو سرمایہ داروں کے غریب مسلمان عوام کے معاشی استحصال کا وہ احساس و شعور بھی برقرار رہتا جو پاکستان کے وجود میں آنے کا اصل اور بنیادی محرک بنا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم بحیثیتِ قوم چاہے خالص عارضی اور محض وقتی طور پر ہی سہی بہرحال آزادئ ہند سے متصلاً قبل کے زمانہ میں 'جذبہ ملی' سے اس درجہ سرشار ہو گئے تھے کہ نہایت ٹھوس حقائق بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ہم نے ان دونوں دور دراز خطوں کا "سنجوگ" ایک متحدہ ملک کی صورت میں قائم کر دیا۔ یہ دراصل قومی سطح پر ہمارے سیاسی افلاس کا ایک بہت بڑا ثبوت اور ہمارے قومی مزاج کی 'جذباتیت' کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر بحیثیتِ قوم ہم میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا تو ہم بہت جلد اس غلطی کا احساس و ادراک کر لیتے۔ اس لیے کہ خان لیاقت علی خان مرحوم کی بی پی سی رپورٹ کا حد درجہ حسرت ناک انجام اسی لیے ہوا تھا کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین بندھن کے لیے کوئی قابلِ قبول دستوری فارمولا تلاش نہ کیا جا سکا۔ لیکن ہماری "جذباتیت" اور حقائق سے گریز کی مستقل عادت پھر آڑے آئی اور ہم نے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد پاکستان میں حکومت کی سطح پر سازشوں اور انقلابوں کا جو چکر چلا اس کا اصل اور بنیادی سبب تو اگرچہ یہ تھا کہ یہاں جو قوم آباد تھی وہ دفعتہً آزاد تو ہو گئی تھی لیکن اس کا سیاسی و اجتماعی شعور ابھی بالکل خام تھا اور یہاں قومی سطح پر نہ کوئی محکم تنظیم موجود تھی نہ مضبوط قیادت لیکن اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ جب ملک کی کوئی دستوری اساس ہی قائم نہ ہو سکی تو لامحالہ ع "خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری!" کے مصداق بے دستوری ہی یہاں کا دستور اور بے آئینی ہی یہاں کا آئین قرار پایا۔ چنانچہ ملک و ملت کا سفینہ کچھ عرصہ تو سازشوں اور انقلابوں کے چھوٹے چھوٹے گردابوں میں ہچکولے کھاتا رہا اور بالآخر ایک بڑے بھنور میں آ پھنسا۔ اور ایوب خان کا گیارہ سالہ "سنہری دور" شروع ہو گیا جس کے دوران میں 'صدارتی طرزِ حکومت' نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے سیاسی محرومی کے احساس کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ دورِ ایوبی میں مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی وغیرہ کی صورتوں میں وہاں کے عوام کی اشک شوئی اور دلجوئی کی بہت سی کوششیں بھی ہوئیں لیکن اس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ان تمام کوششوں کے علی الرغم رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان واقعتہً "مغربی پاکستان کی 'نوآبادی' (Colony) بنتا چلا گیا جس سے وہاں فطری طور پر سیاسی بے چینی مسلسل بڑھتی چلی گئی۔

اس صورتِ حال سے دشمن نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ایک طرف مشرقی پاکستان کی ہندو اقلیت نے جلتی پر تیل ڈالا جو خود ہمارے الفاظ میں "نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے

نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی تھی"۔ اور جو وہاں زبان اور کلچر کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کے احساس کو اجاگر کرنے کا کام بھی مسلسل بیس سال سے کر رہی تھی۔ ہندوؤں کو ابھی اس نہج پر کام کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے میں یقیناً بہت مدت تک جد و جہد کرنی پڑتی لیکن اس سیاسی بے چینی نے ان کے لیے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا اور انہوں نے سیاسی محرومی کے احساس کو بآسانی مغربی پاکستان کے خلاف جذبہ نفرت (Hate Complex) میں تبدیل کر دیا۔ اور دوسری طرف ہمارے عظیم ہمسائے، نے اس آگ کو نہ صرف ہوا دی اور بھڑکایا بلکہ اس کے لیے ہر طرح کا ایندھن بھی فراہم کیا ——— نتیجۃً علیحدگی پسندی کا ایک زبردست رجحان پیدا ہوا اور اس کے لیے ایک عوامی تحریک جڑ پکڑ گئی۔

۱۹۶۹ء میں دوسرے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اگرچہ حکومتِ وقت نے بہت سی حالیہ ایسی غلطیاں بھی کیں مثلاً یہ کہ مغربی پاکستان کی وحدت کو بلاوجہ ختم کر دیا تاہم دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے بعد تک بحیثیت مجموعی سابق صدر یحییٰ کی نیک نیتی پر شک کے لیے کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ اور ان کا ملک کو ہنگاموں اور ایجی ٹیشنوں کی فضا سے نکال کر معروف سیاسی سرگرمی حتیٰ کہ عام انتخابات کی راہ پر لے آنے میں کامیاب ہو جانا تو بلاشبہ بہت قابلِ قدر تھا۔ لیکن اس کے بعد کی داستان نہایت تلخ ہے اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں حکمران ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی اور بے تدبیری ہی نہیں بدنیتی اور بددیانتی کا عظیم شاہکار ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے 'سقوطِ مشرقی پاکستان' کے اصل تلخ جزو یعنی ہماری ذلت آمیز شکست اور عبرت ناک ذلت و رسوائی کے اسباب کا آغاز ہوتا ہے۔

دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ مشرقی پاکستان نے بحیثیت مجموعی علیحدگی پسندی کے حق میں واضح فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی آزادانہ رائے کو عملاً بروئے کار آنے کا موقع دیا جاتا یا کم از کم یہ کہ ان سے واضح انداز میں بات کی جاتی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ حقیقتاً وہ چاہتے کیا ہیں؟ آیا مغربی پاکستان سے مکمل علیحدگی کے خواہاں ہیں یا کسی درجے کا کوئی بندھن قائم رکھنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ راقم نے انتخابات کے نتائج مدینہ منورہ میں سنے تھے اور اسی وقت احباب سے عرض کر دیا تھا کہ اب مشرقی اور مغربی پاکستان کو کوئی طاقت ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ؎

ہر چہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

کے مصداق یہ علیحدگی خوش اسلوبی سے نہ ہو بلکہ بھونڈے طریق پر ہو اور صرف خرابی ہی نہیں خون خرابے کے

ساتھ ہو۔ ساتھ ہی بارگاہِ ربّ العزت میں دعا بھی کی تھی کہ پروردگار! پاکستان کے موجودہ فوجی حکمرانوں کو جنرل ڈیگال ہی کی سمجھ عطا فرما دے کہ وہ اس علیحدگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں لے آئیں!" لیکن افسوس کہ ہماری یہ دعا بارگاہِ رب العزت میں قبول نہ ہوئی اور قوم کے سیاسی اخلاص اور اجتماعی شعور کے فقدان کے نتائج سامنے آ کر رہے۔

اب یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے مشیروں کا "عام انتخابات" کے انعقاد کا کریڈٹ حاصل کرنے کا فیصلہ اس غلط اندازے پر مبنی تھا کہ دونوں خطوں میں چاہے کچھ بڑے بڑے گروپ بھی انتخابات جیت لیں لیکن اکثریت چھوٹے چھوٹے سیاسی گروپوں کی ہوگی جن کو مہرے بنا کر ہم سیاست کی شطرنج پر بازی کھیلتے رہیں گے۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ ان کے یہ اندازے غلط ثابت ہوئے، مغربی پاکستان میں تو پھر بھی پیپلز پارٹی کے بڑے دھڑے کے ساتھ کچھ نہ کچھ چھوٹے گروپ بھی آ گئے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں تو ساری کی ساری سیٹیں عوامی لیگ نے حاصل کر لیں۔ اور اس طرح شطرنج کی کسی بساط کے بچھنے کا امکان ہی موجود نہ رہا۔

بس یہیں سے بدنیتی کے اس سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ جو بالآخر انتہائی ذلت و رسوائی پر منتج ہوا۔ پہلے تو تین ماہ کشمکش و پیچ ہی میں گزار دیئے گئے۔ پھر اسمبلی کا اجلاس طلب بھی کیا تو اس پیشگی اہتمام کے ساتھ کہ وہ بالفعل منعقد نہ ہونے پائے۔

اس مرحلہ پر پاکستان کے موجودہ صدر مملکت اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا کردار بھی نہایت مشکوک اور حد درجہ تباہ کن ثابت ہوا۔ اور اب چاہے بھٹو صاحب اپنے اس وقت کے موقف کی کیسی ہی خوشنما تاویلیں کر لیں حقیقت یہ ہے کہ یہ داغ ان کے دامن پر ہمیشہ قائم رہے گا کہ وہ چاہے دانستہ اس سازش میں شریک نہ رہے ہوں اور محض نادانستہ ہی استعمال ہوئے ہوں بہرحال ایک بہت بڑی تباہی کے اسباب میں شامل ضرور ہو گئے۔ ان کے بارے میں ہمارا اندازہ یہ تھا کہ ان کی جذباتی، سیماب وش، جلد باز اور VOLATILE شخصیت کے ظاہری خول کے اندر ایک سنجیدہ، حقیقت بیں اور ٹھوس CALCULATING شخصیت چھپی ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مشرقی پاکستان کے معاملے میں انہوں نے کسی تدبر اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا۔

اس مسئلے میں تھوڑا سا الزام ہماری رائے میں مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے ان شکست خوردہ سیاست دانوں پر بھی آتا ہے جنہوں نے انتخابات کے فوراً بعد بھٹو دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر شیخ مجیب الرحمٰن کی مدح سرائی اور کارسیبی شروع کر دی اور اسطرح گویا بھٹو صاحب کو بالکل CORNER کر دینے کی کوششیں شروع کر دیں ہمارے نزدیک یہ ان لوگوں کی بے تدبیری اور ناسمجھی کا بہت بڑا ثبوت تھا لیکن اگر بھٹو صاحب کا رویہ

انکے اس طرزِ عمل کے ردِّ عمل کے طور پر عتاب بھی یہ سب شیخ صاحب کے اپنے فہم اور تدبر کے دامن پر ایک بہت بڑا داغ ہے۔

بہر حال اسمبلی کے انتہائی تاخیر کے ساتھ طلب کیئے جانے اور پھر ملتوی کر دیئے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم اپنا مقصود آئینی طریق پر حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حالات بگڑنے شروع ہوئے، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، جس پر پہلے تو حکومتِ وقت نے نہایت پُر اسرار خاموشی اختیار کی اور پھر یکبارگی سخت ترین ملٹری ایکشن کا آغاز کر دیا۔

اس کے بعد کی داستان بہت طویل ہے، اور داستان سرائی یہاں مقصود نہیں۔ مختصراً یہ کہ ملٹری ایکشن کے نتیجے میں لاکھوں افراد گھر بار چھوڑ کر بھارت بھاگ گئے جسے بھارت نے اپنا مسئلہ بنا لیا اور اس کے پردے میں پہلے گوریلے اور مسلح تخریب کار بھیج کر اور پھر براہِ راست حملہ کر کے مشرقی پاکستان کے لیے فوری خطرہ پیدا کر دیا۔ اور پھر وہ چودہ روزہ جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" بن گیا۔

جہاں تک اس 'ذلت آمیز شکست' اور 'عبرت ناک ہزیمت' کے اسباب کا تعلق ہے اب تک اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے یہی ہمارے عوام کی گفتگوؤں کا موضوع بھی رہا ہے اور 'دانشوروں' کے تجزیوں کا بھی۔ اور اب تو اس قضیّے کے باقاعدہ تصفیے کیلئے ایک اعلیٰ سطح کا کمیشن بھی کام کر رہا ہے۔ تاہم اس مسئلے کے بعض پہلو ایسے ہیں جو عوام کی نظروں سے تو اوجھل ہیں ہی، ہمارے علم کی حد تک 'دانشوروں' نے بھی کم از کم تا حال دانستہ یا نادانستہ ان سے اعراض ہی کیا ہے۔ رہا حمود الرحمٰن کمیشن تو غالباً یہ پہلو اس کے دائرۂ تحقیق و تفتیش (SCOPE) سے بھی باہر ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہماری رائے میں ان صفحات میں ان کے جانب مختصر اشارہ مناسب رہے گا۔

اب تک جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اس کا مرکز و محور سابق صدر یحییٰ خاں اور ان کے رفقائے کار فوجی حکمران رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس شکست کے فوری اسباب (EXCITING CAUSES) بہر حال ان لوگوں کی شدید ترین نا اہلی، حد درجہ کی بے تدبیری اور بے بصیرتی حوصلے کی کمی، قوتِ فیصلہ کے فقدان اور اعصاب کے ضعف کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں براہِ راست نتیجہ ہیں ان کی عیاشیوں اور بدکاریوں کا اور ان کے کردار کی پستی، اخلاق کی دناءت اور سیرت کے گھناؤنے پن کا۔ خمر تو کہتے ہی اسے ہیں جو عقل کو ڈھانپ لے، (الخمرُ ما خامر العقل) لہٰذا ہمارے ان حکمرانوں کی کچھ بوجھ اور معاملہ فہمی تو اس راہ سے رخصت ہوئی۔ رہی ہمت جرأت اور حوصلہ و ارادہ تو ان سب کا جنازہ بدکاریوں نے نکال دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف یہ کہ یہ لوگ خود بتاشے کی طرح بیٹھ گئے بلکہ ساتھ ہی ایک پوری قوم بلکہ روئے ارض کی پوری اُمّتِ مسلمہ کی عزت و

ناموس کا دھیلہ کر گئے۔

لیکن، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، یہ سب شکست کے صرف فوری اسباب ہیں اور اس بحر کی گہرائیوں میں " ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ " کے مصداق تہہ بر تہہ تاریکیاں موجود ہیں اور صرف سطح آب پر چمکنے والی چیزوں پر نگاہ رکھنا اور گہرائیوں میں اتر کر حقائق کا مواجہہ کرنے سے گریز کرنا بھی من جملہ ان بیماریوں کے ہے جو ہمیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ اس لیے کہ یہ درحقیقت قومی سطح پر گریز اور فراریت کا وہ مرض ہے جس نے پوری قوم کا مزاج اس طرز پر ڈھال دیا ہے کہ ہر ناکامی اور ہر خرابی کی ساری ذمہ داری کسی ایک یا چند افراد یا کسی ایسے گروہ یا طبقے کے سر منتج کر پوری قوم اپنی جگہ مطمئن ہو جائے اور بڑی سے بڑی ناکامی پر بھی نہ اس کا اجتماعی شعور بیدار ہو، نہ اسے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس و ادراک ہو سکے اور نہ ہی اس کے قومی ضمیر میں کوئی خلش یا چبھن پیدا ہو۔ اس صورت حال کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر دانشوروں اور خصوصاً صحافیوں پر عائد ہوتی ہے کہ ان کا دماغ اور قلم اکثر و بیشتر قوم کے اجتماعی شعور کو تھپک تھپک کر اور لوریاں دے دے کر سلانے ہی کا کام کرتا ہے۔ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اس طبقے کے فہم و ادراک کے قصور کا نتیجہ ہے یا مصلحت بینی اور عافیت کوشی کا ثمرہ۔ اس لیے کہ اس دور میں اصل " سلطان جائر " عوام ہیں اور ان کے سامنے " کلمہ حق " کہنا ——— " لانا ہے جوئے شیر کا ! "

ہمارے نزدیک ہماری ذلت آمیز شکست کے متذکرہ بالا فوری اور سطحی سبب کے نیچے کے تہ در تہ اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ نہ صرف اس جنگ بلکہ اس پورے قضیے میں ہمارا سرے سے کوئی اخلاقی موقف ہی موجود نہیں تھا، بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے انعقاد کے بعد سے جو کچھ ہوا وہ سب بڑی دھاندلی الا صریح بد دیانتی پر مبنی تھا۔ نتیجتاً چاہے ہم خود اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے میں کتنے ہی کامیاب ہو گئے ہوں بہرحال پوری دنیا کے سامنے ہم بالکل ننگے (exposed) تھے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دنیا میں جس کسی نے بھی ہمارے ملٹری ایکشن کی کسی درجے میں مدافعت کی اسے کس قدر بوجھ اپنے ضمیر پر ڈالنا پڑا ہوگا۔ خود ہم اپنے موقف کی مدافعت میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکے وہ یہ تھی کہ اس حمام میں صرف ہم ہی ننگے نہیں ہیں بلکہ ع " ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند ! " بھارت نے بھی تو کشمیر میں یہی کیا تھا اور خود روس بھی تو اپنے کئی حلیف ممالک میں یہی کچھ کر چکا ہے ——!

اس معاملے کا افسوسناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس مسئلے میں بعض ایسے لوگوں نے بھی نہ صرف یہ کہ حکومت وقت کی تائید کی اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے بلکہ عملاً امداد اور تعاون کی روش اختیار کی اور ایک بد دیانت اور شرابی و زانی ٹولے کا آلۂ کار بننا قبول کر لیا جو اس ملک کے سیاسی میدان میں حق و صداقت

کے سب سے بڑے علمبردار رہے ہیں اور جن کا سارا سیاسی کاروبار دین و مذہب کے نام پر چل رہا ہے۔ ہمارا دل اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اگر عمر قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا!" کے مصداق اسی واقعے کو ہماری پوری قوم کی اخلاقی حس کو ماپنے کے پیمانہ بنا لیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا! ـــــ ظلم اور دھاندلی کے خلاف بولنے کی جرأت اور ہمت نہ ہو تو کم سے کم خاموش تو رہا جا سکتا ہے۔ یہ کتنی بڑی ابن الوقتی اور جواری پن ہے کہ انسان اپنے مفادات پر نگاہ رکھتے ہوئے اور ذاتی مواقع کے پیش نظر کسی ظالم کے ظلم میں اس کا ساجھی اور مددگار بن جائے ہماری قوم کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس دھاندلی کے آغاز میں تو مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کا لیڈر اس کا آلہ کار بن گیا اور دوسرے مرحلے (PHASE) میں جب اس لیڈر کو ہوش آگیا اور اس نے دبی زبان سے ہی سہی ظلم کے خلاف کسی قدر بولنا شروع کیا تو اس ملک میں مذہبی سیاست کی سب سے بڑی علمبردار جماعت کو اس ظلم اور زیادتی کا آلۂ کار بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔

شکست کے اسباب و عوامل میں سے دوسرا گہرا سبب یہ ہے کہ ہم تاحال سیاسی اعتبار سے ایک 'نابالغ' قوم ثابت ہوئے ہیں اور ہمارے یہاں جو ذمہ داریاں کسی قومی قیادت کو سنبھالنی چاہئیں تھیں ان کا بوجھ بھی فوج کو اٹھانا پڑا ہے۔ جدید دور کی 'ریاست' (State) ایک بڑا عظیم اور ہمہ گیر ادارہ ہے اور اس میں مختلف ذمہ داریاں مختلف طبقوں کو اٹھانی پڑتی ہیں اور عمر ہر کسے را بہر کارے ساختند!" کے مصداق ہر طبقے کو اپنی مخصوص ذمہ داریوں کے لیے مناسب تربیت (Training) دی جاتی ہے اور جس طرح ملک کے دفاع اور اس کی سرحدوں کا تحفظ نہ عوام کے بس کا ہے نہ سول انتظامیہ کے، اسی طرح اہل سیاست کے حصے کا بوجھ نہ فوج اٹھا سکتی ہے نہ سول انتظامیہ۔ اور کسی قومی تنظیم اور قومی قیادت کے خلا کو کوئی دوسرا ادارہ پُر نہیں کر سکتا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری حالیہ شکست قومی اور اجتماعی سطح پر ہماری مسلسل ناکامیوں ـــــ (FAILURES) اور درجہ بدرجہ پسپائی کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے۔ اور بظاہر تو یہ نتیجہ ہے صرف ہماری فوج بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی بھی صرف سابق عیاش اور بدکردار قیادت کے بودے پن کا لیکن درحقیقت یہ منطقی انتہا ہے ہمارے سیاسی دیوالیہ پن کی اور مظہر اتم ہے پوری پاکستانی قوم کی نااہلیت اور ناقابلیت اور اجتماعی و سیاسی بالغی کا!

جیسا کہ ہم نے جولائی ۶۹ء کے محولہ بالا 'تذکرہ و تبصرہ' میں بھی عرض کیا تھا پاکستان کی ربع صدی کی مختصر سی تاریخ کے ابتدائی گیارہ سالوں کے دوران یعنی ۱۹۴۷ء سے ۵۸ء تک کے عرصے میں پاکستان کے سیاستدانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت

کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن اس نے بہت جلد ایک سابق فوجی کے زیر سربراہی خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا چنانچہ دوسرا گیارہ سالہ دور جو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک جاری رہا درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساس فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کما حقہ ادا کرنے کے لیے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۱۹۶۵ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا۔ اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا تھا، یعنی فوج چنانچہ اب کی بار ایک خالص "جرنیلی حکومت" قائم ہوئی اور فوج نے ملک کے پورے نظم و نسق کو سنبھالا۔ ہم نے اسی وقت عرض کر دیا تھا:

"اس ادارے کا اصل فریضہ دفاع وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں دفاع وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاع وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔"

اب اگر یہ ادارہ ان دو طرفہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں ناکام ہوا تو اس کا الزام جتنا اس کے سر آتا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ پوری قوم پر آتا ہے کہ اس نے اس پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ ڈالا ہی کیوں۔ لہٰذا سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے رفقائے کار کی نااہلیت کے پردے میں دراصل پوری قوم کی نااہلیت کا ظہور ہوا ہے اور ان کی ناکامی اصلاً پوری قوم کی ناکامی ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ ارباب سیاست اور بیوروکریسی کی نااہلیوں اور ناکامیوں کے نتائج صرف اندرون ملک بدانتظامی اور بے چینی و خلفشار تک محدود رہے تھے اور فوج کی ناکامی نے ہماری خامیوں اور نااہلیوں کا بھانڈا بین الاقوامی چوراہے میں پھوڑ کر رکھ دیا اور ہم اپنے قدیم دشمن کے ہاتھوں ایک شرمناک شکست سے دوچار ہو گئے۔

(۵)

موجودہ مارشل لاء کی طوالت

اور بچے کھچے پاکستان کے مستقبل کے لیے خطرات

oooo

ڈاکٹر اسرار احمد

کا خط بنام — صدر پاکستان

جنرل محمد ضیاء الحق بالقابہ

(تحریر: ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۲ء)

شائع شدہ میثاق ستمبر ۸۳ء

> اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
> مَیں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر و صدرِ پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی - مندرجہ ذیل گذارشات پیشِ خدمت ہیں :-

مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ میں معروف اور مروّجہ معنی میں ہرگز سیاسی آدمی نہیں ہوں اور میرے بیشتر اوقات اور تمام تر مساعی مستقبل کے اسلامی انقلاب کے لئے میدان ہموار کرنے کی غرض سے دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کے لئے وقف ہیں - (چنانچہ یہی میرے وفاقی کونسل یا مجلسِ شوریٰ سے استعفے کا اہم ترین سبب تھا - !)

ساتھ ہی مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ یہ حقیقت بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتی کہ کوئی باشعور مسلمان خالص غیر سیاسی نہیں ہو سکتا - بایں معنیٰ کہ وہ ملک و ملّت کے حالات سے قطعاً بے خبر یا لاتعلق رہے اور قوم و وطن کی صلاح و فلاح یا اُن کو درپیش خطرات و خدشات کے بارے میں سوچ بچار اور غور و فکر سے بھی کام نہ لے -

چنانچہ میں بھی اس ضمن میں اپنی امکانی حد تک حالات کا مشاہدہ بھی کھلی آنکھوں سے کرتا ہوں اور دوسروں سے تبادلہ خیال بھی کھلے قلب و ذہن کے ساتھ کرتا ہوں (اور اس سلسلے میں مجھے اپنے اُن دوروں اور سفروں سے بھی مدد ملتی ہے جو مجھے اپنی دعوتی و تبلیغی مساعی کے ضمن میں اندرونِ ملک یا بیرونِ وطن کرنے پڑتے ہیں) — اور پھر خود غور و فکر بھی کرتا ہوں اور اس کے نتیجے میں جو رائے بھی میری بنے، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے مطابق مشورہ پورے نصح و خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ عوام کو بھی دوں اور ان کو بھی جن کے ہاتھوں میں ملک و قوم کی زمام کار ہے - از روئے فرمانِ نبویؐ : "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" یعنی "دین تو نام ہی نصح و اخلاص اور خیر خواہی و وفاداری کا ہے" اور جب پوچھا گیا "لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ؟" یعنی "حضورؐ! کس کے ساتھ ؟" تو ارشاد ہوا : "لِلّٰہِ وَلِکِتٰبِہٖ

وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ"۔ یعنی "اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے ساتھ اخلاص و وفاداری اور مسلمانوں کے اُولوالامر اور عوام دونوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی!"

یہی وجہ ہے کہ آج سے سوا دو سال قبل اغلباً ۱۸ اگست ۸۰ء کو اسلام آباد میں علماء کنونشن سے قبل منعقدہ مشاورتی اجلاس کے موقع پر جب میں نے آپ سے چند منٹ علیحدگی میں گفتگو کی تھی، تب بھی بعض مشورے آپ کے گوش گذار کئے تھے جن کا تعلق اکثر و بیشتر ملک کی سیاسی صورتِ حال سے تھا اور پھر جب اوائل مئی ۸۲ء میں لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں، میں 'شوریٰ' سے اپنا استعفیٰ پیش کرنے حاضر ہوا تھا، تب بھی میں نے بعض مشورے دیئے تھے جن کا تعلق اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ سے تھا — اور اللہ گواہ ہے — اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا دل بھی گواہی دے گا کہ ان دونوں مواقع پر میرا محرک مندرجہ بالا احادیث نبویؐ کے مطابق نصح و خیر خواہی کے جذبے کے سوا اور قطعاً کچھ نہ تھا! — اور خالصتہً اسی جذبے کے تحت آج پھر میں اس عریضے کے ذریعے حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں، اس دُعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے حق کہنے اور آپ کو حق سننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ آمِیْن یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔

جہاں تک اس ملک میں 'اسلامی شعائر کی ترویج اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ — یا بالفاظ دیگر 'اسلامی نظام' کے قیام کا تعلق ہے اس کے بارے میں مجھے اس وقت کچھ عرض نہیں کرنا۔ جس کا اصل سبب، میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں، یہ ہے کہ اس معاملے میں میں آپ سے قطعاً مایوس ہو چکا ہوں — اور عرض و معروض یا گلہ شکوہ وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی توقع موجود ہو!

مجھے خوب معلوم ہے کہ اس ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی ہر اعتبار سے نہایت بگڑے ہوئے معاشرے میں اسلام کا قیام و نفاذ کوئی آسان کام نہیں اور اس کیلئے

یقین محکم پر مبنی جرأتِ مومنانہ اور علم راسخ پر مبنی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ کو تقدیرِ الٰہی نے جو ایک موقع عطا فرمایا تھا کہ آپ ع "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا" کے مصداق اگر دینِ حق کے قیام و نفاذ کے لئے بھرپور کوشش اور پورے جرأت مندانہ اقدام کے باوجود خدانخواستہ ناکام رہتے تو کم از کم ایک ایسی مثال تو تاریخ میں چھوڑ جاتے کہ اگر ایک غیر مسلم (پرنس آف ویلز بعدہٗ ڈیوک آف ونڈسر) ایک عورت کی خاطر وقت کی عظیم ترین سلطنت کے تخت سے دست بردار ہو سکتا ہے تو ایک مسلمان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی اسلام کی خاطر حکومت و اقتدار کو قربان کر سکتا ہے۔ مجھے شدید افسوس ہے کہ آپ اس موقع کا حق ادا نہ کر سکے۔

اس ضمن میں، جیسا کہ میں نے ۲۰ اگست ۸۰ء کو علماء کنونشن میں اپنی تقریر میں عرض کیا تھا، ابتدائی تین سال، جو اس اعتبار سے نہایت قیمتی تھے کہ "تحریکِ نظامِ مصطفیٰ" کا جوش و خروش برقرار تھا اور ملکی فضا میں وہ کیفیت قائم تھی کہ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے ضمن میں بڑے سے بڑا اقدام بھی بلا روک ٹوک کیا جا سکتا تھا، تعطل اور تربص کے نذر کر دیئے گئے (اس طرح اُسی غلطی کا اعادہ ہو گیا جس کا ارتکاب پاکستان میں برسرِ اقتدار آنے والی اوّلین قیادت نے کیا تھا)۔

پھر جب حدود اور زکوٰۃ آرڈی نینس کا اجرا ہوا اور اس پر اہلِ تشیع کی جانب سے جارحانہ ردِ عمل ظاہر ہوا تو نہ صرف یہ کہ گھٹنے ٹیک دیئے گئے بلکہ ——— زیادہ قابلِ افسوس اور اہم تر بات یہ کہ نظامِ زکوٰۃ کے ضمن میں شیعہ اور سُنّی کے مابین تفریق کر کے ضعیف الایمان یا ناواقف سُنّیوں کے شیعہ بن جانے کا دروازہ کھول دیا گیا ——— اس کے باوجود کہ میں نے ۱۸ اگست ۸۰ء کے مشاورتی اجلاس میں خدا کا واسطہ دے کر عرض کیا تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ زکوٰۃ آرڈی نینس پورے کا پورا واپس لے لیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو حسبِ سابق عوام کا نجی معاملہ قرار دیدیں ——— لیکن خدارا اس میں شیعہ اور سُنّی میں فرق و امتیاز نہ قائم فرمائیے گا۔

اجتماعیاتِ انسانیہ کے ذیل میں اوّلین معاملہ عائلی اور سماجی نظام کا ہے اور اس ضمن میں ایک طرف عائلی قوانین کو شریعت کورٹ کے دائرہ کار اور حدودِ اختیار میں لانے کی جرأت آپ اس لئے نہیں کر پائے ہیں کہ بعض اعلیٰ طبقات کی بیگمات اور کچھ مغرب

زدہ خواتین کی جانب سے ناموافق ردِ عمل کا اندیشہ ہے — اور دوسری طرف معاشرے میں خواتین کے مقام و کردار اور ستر و حجاب یا خود آپ کے الفاظ میں "چادر اور چار دیواری" کے ضمن میں اسلام کے نقطۂ نظر کے بارے میں جو اختلافات گذشتہ دنوں ہمارے ملک میں زور شور سے ظاہر ہوئے، اس کے بارے میں اگرچہ زبانی تو آپ نے کچھ باتیں ایسی بھی کہیں جو دینی طبقات کے لئے اطمینان بخش تھیں، لیکن عملاً اپنا پورا وزن مغرب زدہ اور اباحیت پسند حلقے میں ڈال رکھا ہے (بالخصوص آپ کے حالیہ غیر ملکی دوروں کے دوران آپ کی اہلیہ صاحبہ محترمہ کا یہ طرزِ عمل کہ سر سے چادر بھی اتر گئی — اور نامحرموں سے مصافحہ بھی ہو گیا — از خود بھی فیصلہ کن تھا، لیکن اس پر مزید مہر تصدیق آپ کے اُن فرمودات سے ثبت ہو گئی جو آپ نے اغلباً ہوسٹن میں ارشاد فرمائے تھے۔)

بنابریں پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے عظیم معرکے کے آپ کے ہاتھوں سر ہونے کی اب کم از کم مجھے کوئی امید باقی نہیں رہی — اور مجھے اس رائے تک پہنچنے میں کہ یہاں اسلام صرف انقلابی طریق کار ہی سے آ سکتا ہے، آپ کے اس جملے نے بھی مدد دی ہے جو رحیم یار خان میں بلدیاتی نمائندوں کے ایک اجلاس میں ایک برقع پوش خاتون کونسلر کے تابڑ توڑ سوالات کے جواب میں کہ آپ نفاذِ اسلام کے لئے یہ کیوں نہیں کرتے؟ اور وہ کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "بیٹی! اس ملک میں اسلام کسی انقلابی عمل کے نتیجے میں نہیں آ رہا کہ ہم اتنے بڑے بڑے قدم اُٹھا سکیں!!" (یہ روایت ہے رحیم یار خاں کے معروف دینی اور سماجی کارکن ڈاکٹر محمد نذیر مسلم صاحب کی، جو اس خاتون کونسلر کے ماموں ہیں)

تاہم پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کے ضمن میں ایک مشورہ میں آپ کی خدمت میں ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں اور اصلاً اسی کے لئے یہ عریضہ تحریر کر رہا ہوں چونکہ مجھے اپنے ذاتی مشاہدات و معلومات اور حالات کے تجزیے اور جائزے سے شدید اندیشہ لاحق ہے کہ مستقبل کا مورخ کہیں یہ نہ کہے کہ "۱۹۴۷ء میں 'پاکستان' کے نام سے مسلمانوں کی جو عظیم ترین مملکت وجود میں آئی تھی اُسے اوّلاً تو ۱۹۷۱ء میں دو لخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے نے اور پھر اس کے مزید ٹکڑے ہونے

(Balkanistan) کا حادثہ رونما ہوا ایک پابندِ صوم وصلوٰۃ اور دین دار، پرہیزگار شخص کے ہاتھوں!!" معاذاللہ! ثم معاذاللہ!!!

آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۸ راگست ۸۰ء کو بالکل علیحدگی میں گفتگو کے دوران میں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ "ملک میں جو سیاسی خلا مارشل لاء کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے، اُس کو دور کرنے کے لئے آپکے ذہن میں نقشہ کیا ہے۔؟ میری رائے میں تو یہ سیاسی خلا (Political vacuum) خودکشی (Suicide) کے مترادف ہے!!" — اس پر آپ نے گہرے تاثر کے انداز میں فرمایا تھا کہ "ڈاکٹر صاحب! میں نے اپنا تو جائزہ لے لیا ہے کہ میرے اندر ہمت نہیں ہے (جس کے معنی میں نے یہ لئے تھے کہ آپ صدر ایوب مرحوم کے طرزِ عمل کی جانب اشارہ کر رہے ہیں) لیکن موجودہ سیاسی جماعتوں کو حکومت دے دینے کو بھی میں انتہائی (Suicidal) سمجھتا ہوں اور تیسری کوئی شکل موجود نہیں ہے!" — جس پر میں نے عرض کیا تھا کہ "نہیں جناب! تیسری صورت موجود ہے اور وہ یہ کہ آپ No party basis پر الیکشن کرا دیں! (Shortest possible notice) اور" — تو آپ نے فرمایا تھا کہ "ہاں اس پر ہم غور کر رہے ہیں کہ SHORT NOTICE اور (No party basis) نیز ایک .L.F.O کے ساتھ الیکشن کرا دیں!" — آخر میں میں نے عرض کیا تھا کہ "یہ بالکل درست خیال ہے لیکن آپ آخر کب تک سوچتے رہیں گے؟ جلدی کیجئے! Time is running ou for you" — آج اس گفتگو کو سوا دو سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا لیکن افسوس ہے کہ وہ سیاسی خلا جوں کا توں موجود ہے اور آپ کی جانب سے اس کے دُور کرنے کے لئے تاحال کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اس ضمن میں غالباً آپکے اطمینان کا باعث یہ امر ہے کہ آپکے خلاف کوئی عوامی تحریک نہ تاحال چل سکی ہے، نہ ہی اس کا کوئی فوری اندیشہ موجود ہے — اس سلسلے میں میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ خدارا اس صورت حال سے دھوکہ نہ کھائیے۔ اس لئے کہ اس کا اصل سبب بین الاقوامی حالات ہیں جن کے باعث پاکستان کے محبِّ وطن بالخصوص دینی و مذہبی مزاج کے لوگ کوئی

Risk لینے کو تیار نہیں ہیں — لیکن ایک بات تو کون نہیں جانتا کہ بین الاقوامی حالات میں کوئی تبدیلی کسی بھی وقت رُونما ہو سکتی ہے اور دوسرے کسی ملک کے بقا و استحکام کے لئے یقیناً بین الاقوامی صورتِ حال بھی کسی قدر اہم ہوتی ہے لیکن اصل اہمیت اس ملک کے اپنے عوام کا اطمینان ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں بالخصوص اندرونِ صُوبہ سندھ جو لاوا پک رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس کا علم آپ کو بھی لازماً ہوگا۔ لیکن میں اس امکان کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا کہ بعض اوقات صاحبِ اقتدار لوگوں کے اردگرد جن لوگوں کا حصار قائم ہو جاتا ہے وہ اُسے صحیح صورتِ حال سے مطلع نہیں ہونے دیتے۔ واللہ اعلم!

میرے اندازے میں سندھ میں "سندھو دیش" کے لئے میدان پوری طرح اُسی طرح ہموار ہو چکا ہے جیسے مشرقی پاکستان میں "بنگلہ دیش" کے لئے ہوا تھا اور اب فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور کٹا ہوا تھا، اس لئے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کر سکی اور سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے۔ لہٰذا یہاں ایسی کسی بھی تحریک کو بآسانی کچلا جا سکتا ہے، لیکن میرے نزدیک اس عامل (Factor) پر بہت زیادہ انحصار بھی سخت ناعاقبت اندیشی ہے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ہمارے سیاسی مبصروں اور تجزیہ نگاروں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اس سبب کو بیان کیا تھا کہ پاکستان میں (ایوب خان مرحوم کے) مارشل لاء کے نفاذ نے وہاں کے لوگوں میں سیاسی محرومی کا احساس پیدا کر دیا تھا اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھ میں سب سے بڑی دلیل یہ آ گئی تھی کہ فوج چونکہ ساری مغربی پاکستان کی ہے لہٰذا فوج کی حکومت کے معنی یہ ہیں کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان پر حکومت کر رہا ہے — آج بعینہٖ یہی دلیل سندھ کے علیحدگی پسند لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ فوج کا اکثر و بیشتر حصہ پنجاب سے ہے اور کچھ تھوڑا سا سرحد سے۔ لہٰذا مارشل لاء کے پردے میں اصلاً "پنجاب" ہم پر حکومت کر رہا ہے — اور ہر گزرنے والا دن اس دلیل کو قوی سے قوی تر کر رہا ہے —!

بنا بریں میں عرض کرتا ہوں کہ خدارا اس تعطل کو جلد از جلد رفع کرنے کی جانب واضح پیش قدمی فرمائیے ایسا نہ ہو کہ یہ آتش فشاں پھٹ پڑے اور پھر ملک و ملت کے کسی بھی خواہ کے کئے کچھ نہ ہو سکے —!!

مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایک جانب ہم اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس میں (اکثر سیاسی جماعتوں کے 'مبینہ' موقف کے مطابق) ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت انتقالِ اقتدار کے لئے فوری انتخاب میں بہت سی پیچیدگیاں مضمر ہیں — دوسری جانب ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں آپکے ذہن میں جو مختلف تجویزیں ہیں، وہ بھی ملک و ملت کی خیر خواہی کے جذبے پر مبنی ہیں — اور تیسری جانب مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے بھی جو اختلافِ رائے ان موضوعات پر سامنے آ رہا ہے کہ انتخابات جداگانہ ہوں یا مخلوط؟ — اور حسب سابق ہوں یا متناسب نمائندگی کے اصول پر-؟ وغیرہ وغیرہ — وہ بھی یقیناً خلوص و اخلاص ہی پر مبنی ہیں — لیکن میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ ان معاملات میں آخری فیصلہ کرنے کا مجاز کون ہے؟ کیا صرف آپ اور آپکے "رفقاءِ کار" یعنی مارشل لاء انتظامیہ؟ یا زیادہ سے زیادہ وہ سیاسی جماعتیں جو کسی درجے میں آپ کی منظور نظر ہیں یا کم از کم آپ کے لئے قابلِ قبول ہیں —؟؟ یا کوئی اور —؟؟؟

میں اس مسئلہ پر کم و بیش چھ ماہ سے مسلسل غور کرتا آ رہا ہوں — اور ایک رائے جس پر میرا دل ٹھک گیا ہے، تجویز کی صورت میں خالصۃً ملک و ملت اور خود آپکی خیر خواہی کے جذبے کے تحت آپکے سامنے رکھ رہا ہوں وہ تجویز یہ ہے کہ:-

(۱) ملک میں ایک انتخاب فوراً ہو — یعنی فروری یا مارچ ۱۹۸۳ء میں — لیکن یہ انتخاب انتقالِ اقتدار یا تشکیلِ حکومت کے لئے نہ ہو بلکہ ایک 'منتخب مجلسِ شوریٰ' یا 'مجلسِ ملی' کے لئے ہو — اس میں حق رائے دہی کی اساس اور حلقہ جات کی تشکیل تو بالکل وہی ہو جس پر فروری ۷۷ء میں انتخابات ہوتے تھے — لیکن ہو یہ خالص غیر جماعتی بنیاد (No party basis) پر —!

(۲) اس طرح جو مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملی وجود میں آئے، اس کے سامنے ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں جو تجاویز آپکے سامنے ہیں، وہ آپ رکھیں اور طرزِ انتخاب وغیرہ کے ضمن میں جو باتیں دوسرے لوگوں کے سامنے ہیں، انہیں وہ رکھیں — اور ان تمام امور پر یہ مجلس ایک سال کے عرصے کے اندر اندر فیصلہ دے، جو نہ صرف یہ کہ دو تہائی اکثریت پر مبنی ہو بلکہ ہر صوبے سے منتخب

شدہ لوگوں کی بھی کم ازکم نصف تعداد لازماً اس میں شامل ہو —!

(۳) اگر یہ مجلس اس مشکل مرحلے کو کامیابی سے سر کر لے اور مطلوبہ اکثریت کے ساتھ نظام تجویز کر دے تو مارشل لاء انتظامیہ تین سے چھ ماہ کے عرصے کے اندر اندر اس کے مطابق انتقالِ اقتدار اور تشکیلِ حکومت کے لئے الیکشن کرا دینے کی پابند ہو — اور اگر وہ مجلس ایک سال کے اندر اندر تفویض کردہ ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو وہ از خود تحلیل (Dissolve) ہو جائے اور پھر تین سے چھ ماہ کے عرصے میں اسی 'مجلسِ شوریٰ' یا 'مجلسِ ملی' کا انتخاب دوبارہ ہو اور جب تک مطلوبہ اتفاقِ رائے (Consensus) حاصل نہ ہو، یہ سلسلہ جاری رہے — اور اس دوران میں فوج کے لئے نہ صرف اخلاقاً جائز بلکہ ملک و قوم کی حفاظت و سالمیت کے اعتبار سے لازم سمجھا جائے کہ وہ Care Taker کی حیثیت سے کاروبارِ حکومت چلاتی رہے —!

اس تجویز کے محاسن یا روشن پہلوؤں پر گفتگو کو میں اس لئے تحصیلِ حاصل سمجھتا ہوں کہ وہ اظہر من الشمس ہیں — البتہ اس کے خلاف اس واحد دلیل کا جائزہ لینا لازمی ہے جو بادی النظر میں بہت قوی معلوم ہوتی ہے یعنی کہ کہیں مجوزہ مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملی ایک بھرپور "دستوریہ" / (Full fledged Constituent Assembly) کا کردار اختیار نہ کر لے اور دستورِ ملکی کے خطرناک صندوقچے (Pandora's Box) کو کھول کر اُن نازک اور پیچیدہ مسائل کو از سرِ نو نزاعی نہ بنا دے جو ۱۹۷۳ء کے دستور میں طے شدہ ہیں۔

میرے نزدیک یہ دلیل بہت کمزور اور بودی ہے، اس لئے کہ مسائل کا حل ان سے اعراض اور صرفِ نظر سے نہیں بلکہ مقابلے اور مواجہے یعنی (Face) کرنے ہی سے ممکن ہوتا ہے — پاکستان کا قیام محض ایک وقتی حادثہ نہ تھا بلکہ ہندوؤں

کے علی الرّغم پاکستان صرف اِس لئے قائم ہوا کہ ایک طرف مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں کے انتقامی طرزِ عمل کے اندیشے کا منفی محرّک موجود تھا تو دوسری طرف احیائے اسلام کا مثبت جذبہ بھی موجود تھا جسے قائدِ اعظم مرحوم کے مسلسل اعلانات نے ایک نہایت قوی امید کی صورت دے دی تھی — اور تیسری طرف ارادہ الٰہی اور مشیتِ ایزدی بھی شاملِ حال تھی جو اصل فیصلہ کن عامل (Factor) ہے — اور یہ تینوں عوامل اب بھی پوری قوّت و شدّت کے ساتھ موجود ہیں — ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے (یعنی Mobilise کیا جائے!) اور یہ کام ان شاءاللہ اس مجوّزہ مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملّی اور اس کیلئے منعقد ہونے والے انتخابات کے ذریعہ ہو جائیگا۔ اسلئے کہ چونکہ یہ انتخابات نہ تشکیل حکومت کے لئے ہوں گے اور نہ ہی جماعتی بنیاد (Party Basis) پر ہوں گے لہٰذا اس میں سیاسی حلقوں اور جماعتوں کی صف بندی (Polarisation) خالصتہً اس اساس پر ہوگی کہ کون محبِّ دین اور محبِّ وطن ہے — اور کون لادینیت، الحاد، مادہ پرستی، اباحیت اور علاقائی و لسانی قومیتوں کا عاشق اور پرستار — !! — اور مجھے یقین ہے کہ اگر تقسیم اس واضح اساس پر ہو تو ان شاء اللہ فیصلہ کن فتح محبِّ اسلام اور محبِّ پاکستان قوتوں کو حاصل ہوگی۔ جیسے کہ اکثر مبصرین اور تجزیہ نگار حضرات نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کہا تھا کہ وہاں اگر لوگوں کے سامنے اصل مسئلہ یہ رکھا جاتا کہ 'پاکستان' کے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اُس سے علیحدہ ہونا؟ — تو وہاں کے عوام کی غالب اکثریت لامحالہ 'متحدہ پاکستان' کے حق میں رائے دیتی!) مجھے اس تجزیہ سے کامل اتفاق ہے — اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ میری تجویز پر عمل درآمد کے نتیجے میں ان شاءاللہ العزیز 'تحریک پاکستان' کے از سرِ نو احیاء کا وہ مقصد باحسن وجوہ حاصل ہو جائے گا جس کے لئے آپ ہر سال 'یوم پاکستان' — 'یوم اقبال' — اور 'عید میلاد النبیؐ' منانے کے ضمن میں کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں۔ (جو معاف فرمایئے، اکثر و بیشتر ضیاعِ محض ہے — !)

میں اپنی اس تجویز اور اس کی افادیت پر بحمداللہ عقلی اور نظری اعتبار سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا ایک وجدانی احساس

بھی ہے، جسے میں آپ پر ظاہر کر دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا — اور وہ یہ کہ قرآنِ حکیم میں سورۃ مائدہ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ مصر کے طویل دورِ غلامی کے نتیجے میں ان میں سیرت و کردار کا جو زوال و انحلال پیدا ہو گیا تھا، وہ چالیس برس کی صحرا نوردی کے بعد رفع ہو سکا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں بھی آزادی کے بعد بے یقینی اور بے مقصدیت کے صحرائے تیہ میں بھٹکتے ہوئے چالیس برس کے لگ بھگ ہونے کو آئے ہیں تو کیا عجب کہ اب اس بھٹکے ہوئے راہی کو منزل کا سراغ مل ہی جائے — !! اور مملکتِ خداداد پاکستان عالمی سطح پر احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کے انقلاب آفریں عمل کے ضمن میں اپنے مثبت کردار کو ادا کرنے کے لئے کمربستہ اور سرگرمِ عمل ہو ہی جائے — !!! وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝

بصورتِ دیگر مجھے شدید اندیشہ ہے کہ ہمارا ملک تدریجاً جس محاذ آرائی کی جانب بڑھ رہا ہے اس کے دھماکہ خیز صورت اختیار کرنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی اور آپ کے تاحال امریکہ اور روس کے مابین جو نازک توازن برقرار رکھا تھا، اس میں آپ کے حالیہ دورۂ امریکہ کے بعد جو تبدیلی آئی ہے اُسکی بنا پر روس اور بھارت دونوں ایسی کسی بھی صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے — اور اس کا نتیجہ ملک و ملت کے حق میں کسی طرح بھی خوش آئند نہ ہوگا۔

فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

۲۷ دسمبر ۸۲ء

مطابق ۱۰ ربیع الاوّل ۱۴۰۳ھ

سیرتِ نبوی کے ضمن میں ۲ عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے — اعلیٰ و دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ

★ رسول کامل ★

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور

فرائض دینی اور اسوۂ رسول

سورۂ احزاب کے رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

oooooooooooooo

وقت کے اہم نازک اور زیر بحث موضوع

اسلام میں عورت کا مقام

پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کا مدلل و مفصل خطاب

کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

جس میں اس خطاب کے علاوہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تالیف "نقوش اقبال" سے ماخوذ

عورت اقبال کے کلام میں

نیز اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کا ماہنامہ آنچل کراچی میں
شائع شدہ انٹرویو اور روزنامہ جنگ لاہور فورم میں بات چیت بھی شامل ہیں

عمدہ آفسٹ پیپر — اعلیٰ طباعت — صفحات ۱۳۰

قیمت —— فی نسخہ ڈیڑھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

—— ملنے کا پتہ ——

(۱) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن — ۳۶ کے ، ماڈل ٹاؤن لاہور
(۲) مکتبہ تنظیم اسلامی — نمبر ۸ داؤد منزل نزد آرام باغ کراچی

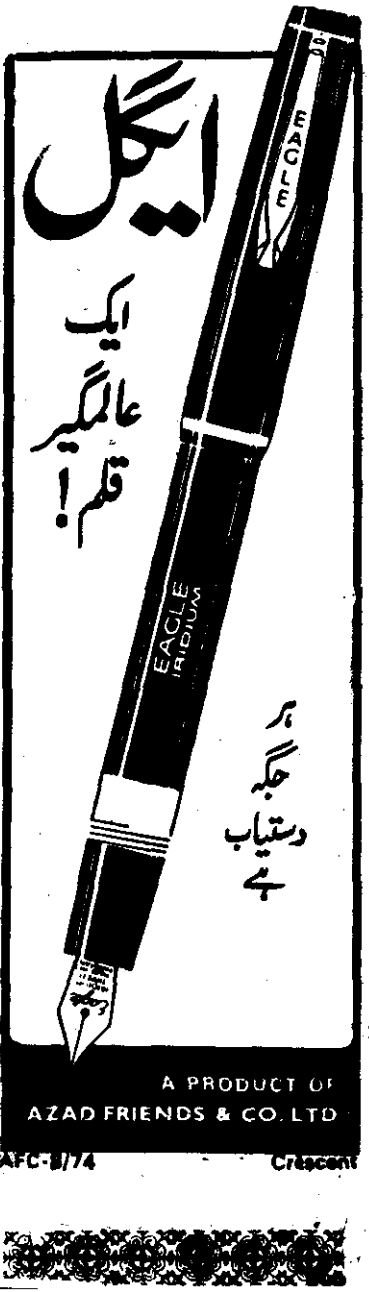

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

Regd L No 7360

[illegible] "MEESAQ" LAHORE

[illegible] | NOVEMBER 1985 | No 11

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of .

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

5 [illegible] CENTRE
[illegible] KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE
TELEPHONE : 870512 880731